کام کرنے والوں کو آئندہ اس سے بڑی مدد ملے گی، یہ کتاب تلاش و محنت سے مرتب کی گئی ہے اور اس سے مصنف کے علمی و ادبی ذوق، ترتیب و تالیف میں سلیقہ مندی اور نقد و نظر کی صلاحیت کا اندازہ ہوتا ہے، انھوں نے اپنی تحقیق و جستجو سے متعدد فراموش شدہ کتابوں اور ان کے مصنفین کا نام ضائع ہونے سے بچا لیا، اس کتاب میں ۱۸۵۷ء سے قبل کے نثری کارناموں کا اجمالی ذکر بھی آگیا ہے، اس سلسلہ میں مصنف نے پیش رو اہل قلم کی کاوشوں کا خلاصہ پیش کیا ہے اور کہیں کہیں اس پر مفید اضافہ کیا ہے، چوتھے باب میں داستان، تمثیل اور ناول کی کتابوں کا مبسوط تعارف کرایا ہے، مگر دوسری نوعیت کی اہم کتابوں پر اس قدر سیر حاصل بحث نہیں کی ہے، ص ۲۰۱ پر وسیلۂ شرف و ذریعۂ دولت کا ذکر چند سطروں میں کیا ہے، اور ان کے مصنف کے حالات تو درکنار اس کا پورا نام بھی تحریر نہیں کیا ہے، ان دونوں کتابوں کا چوتھا اڈیشن مصنف کے ہم صوبہ ڈاکٹر محمد طیب ابدالی کی تصحیح و تحشیہ کے بعد ۱۹۶۵ء میں شائع ہوا ہے، مگر معلوم ہوتا ہے کہ انکو اسکے ایک ہی اڈیشن کا علم ہے، انھوں نے وسیلۂ شرف کا سنہ تصنیف ۱۳۱۴ھ بتایا ہے جبکہ خود اسکے آخر میں ۱۳۱۲ھ اور ڈاکٹر محمد طیب نے ۱۳۱۱ھ لکھا ہے، نیز انھوں نے دونوں کے متعلق لکھا ہے "یہ پہلی مطبع پنچ باکی پور سے ۱۳۱۶ھ میں شائع ہوئیں" حالانکہ ڈاکٹر محمد طیب کا بیان ہے کہ انکی پہلی اشاعت مصنف کی زندگی ہی میں احسن المطابع پٹنہ سے ۱۳۱۳ھ میں ہوئی اور دوسری اشاعت مطبع اخبار الپنچ باکی پور پٹنہ سے ۱۳۲۲ھ میں ہوئی، مشہور اشخاص کے مفصل حالات تحریر کرنے کے بجائے، غیر معروف اشخاص کا مبسوط حال قلم بند کرنا چاہئے تھا، مصنف کو اعتراف ہے کہ اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا زیادہ حصہ ہے، مگر انھوں نے تصوف کی کتابوں کا ذکر کسی مستقل عنوان کے تحت نہیں کیا ہے، رد شیعیت کی کتابوں کے آخر میں بلا عنوان فقہی و دینی کتابوں کا ذکر بے موقع ہے، ص ۸۰ پر ایک کتاب کا نام جلاء العینین مع المدۃ رکنا النزول فی وضع الیدین علی الصدر و تحت السرہ لکھکر اسکا موضوع یہ بتایا ہے "کتاب و سنت کی روشنی میں ترک رفع یدین کو صحیح اور جائز ثابت کیا گیا ہے" مگر نام سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں نماز میں سینہ کے بجائے ناف کے نیچے ہاتھ باندھنے کو صحیح ثابت کیا گیا ہوگا، بعض جگہ ثقیل، نامانوس بلکہ غیر مناسب الفاظ لکھے ہیں مثلاً "رد عیسائیت میں چند رسائل لکھے تھے جواب مفقود الخبر ہیں (ص ۹۴) حسن اتفاق یہ ہے کہ تینوں جس طرح نصائح میں مشترک ہیں" (ص ۲۴۳) بعض کتابوں کے نام بھی تصحیح طلب ہیں۔

"ض"

جلد ۱۳۰ ماہ ذی الحجہ ۱۴۰۲ھ مطابق ماہ اکتوبر ۱۹۸۲ء عدد ۴

مضامین

ایک ضروری تصحیح

معارف بابت ماہ جنوری ۱۹۸۲ء کے صفحہ ۶۹ پر قرآن مجید کی آیتوں کی طباعت کی غلطیوں کی تصحیح ناظرین اسطرح کر لیں

سطر	غلط	صحیح
۷ و ۸	عیسی ابن مریم ورسول اللہ	عیسی ابن مریم رسول اللہ
۱۲	یُبَشِّرُكَ	یُبَشِّرُكِ
۱۲ و ۱۳	المسیح بن مریم	المسیح عیسی ابن مریم

شذرات

کشمیر کی گل پوش وادی کے شیر شیخ عبداللہ اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے اب وہاں ہیں جہاں ایک روز سب کو جا کر بارگاہِ ایزدی میں اپنا اپنا اعمالنامہ پیش کرنا ہے، اللہ تعالیٰ ان کو اپنی رحمتِ بے پایاں سے سرفراز فرمائے، آمین۔

نجی مجلسوں میں اکثر یہ گفتگو رہتی ہے کہ ہندوستان میں انیسویں صدی میں جتنی عظیم اور قد آور شخصیتیں پیدا ہوئیں اتنی بیسویں صدی میں نہ ہو سکیں، مگر اس صدی میں جو چند عظیم المرتبت شخصیتیں پیدا ہوئیں ان میں شیخ عبداللہ بھی تھے، ان کی زندگی شروع سے فعال، متحرک اور ہنگامہ پرور رہی، اپنی جوانی میں مہاراجہ کشمیر کی استبدادیت سے ٹکر لی، اور جیل گئے، پاکستان کی تحریک اور اس کے قیام کے بعد محمد علی جناح سے بھی تصادم مول لیا، ۱۹۴۷ء کے بعد کشمیر کا الحاق ہندوستان سے کر کے اپنے سیکولرزم کا ثبوت دیا، اور پاکستان سے جنگ بھی کی، لیکن پھر کشمیر کی مخصوص حیثیت کی خاطر اپنے دوست پنڈت جواہر لال نہرو سے بھی ان کی وزارتِ عظمیٰ کے زمانہ میں سیاسی اور دستوری ہنر آزمائی کی، جس کے نتیجہ میں اپنی جوانی کے بہترین ایام قید اور نظر بندی کی صعوبتوں میں گذارے، حکومتِ ہند سے اُن کی معرکہ آرائی الف لیلیٰ کی داستان سے کم نہیں، جھپٹنے، پلٹنے، پلٹ کر جھپٹنے، جھپٹ کر پلٹنے، کشمیر کے عوام کے استصوابِ رائے، حقِ خود اختیاری، اور سرزمین کشمیر کی آزادی کے نعرے بلند کرتے رہے، مگر جب یہ فضا میں صرف گونج کر رہ گئے، تو پھر حکومت سے مفاہمت کر لی، کشمیر کے وزیر اعظم تو نہیں لیکن وزیر اعلیٰ بن گئے، اور اسی حیثیت سے ان کی وفات بھی ہوئی، اور جنازہ بھی اُٹھا جس کے بے پناہ ہجوم سے کشمیر میں ان کی محبوبیت کا اندازہ ہوا،

وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے ان کا زریں کارنامہ یہ ہے کہ کشمیر میں یونیورسٹی تک تعلیم مفت کر دی، اردو کو اپنی ریاست کی سرکاری زبان بھی بنایا، گو ان کی مادری زبان کشمیری تھی لیکن کشمیری زبان سے اپنی محبت بھی برقرار رکھی، اور اُن ہی کی سرپرستی میں یہ ترقی کر کے ایک اچھی علمی زبان بن گئی ہے، پھر ریاست کی ڈوگری

اور لداخی زبانوں کو فروغ دینے میں ہر قسم کی سہولتیں فراہم کیں جو اُن کے سیکولرزم کی مزید مثال ہے،

۱۹۴۷ء کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کی قیادت کرنے والا کوئی نہیں رہا تو شیر کشمیر کی جری اور بہادر شخصیت کی طرف نظر اٹھی تھی لیکن وہ مولانا محمد علی جوہر اور نہ مولانا ابو الکلام آزاد بن سکے، شاید طویل قید و بند کی صعوبتوں سے تھک چکے تھے یا انھوں نے صرف کشمیر ہی کے لئے جامِ حیات نوش جاں فرمانا طے کر لیا تھا، اپنی وزارت کے زمانہ میں بہت کم باہر نکلے، ہندوستان کے چھوٹے بڑے وزیر کسی نہ کسی بہانہ سے ممالکِ غیر کی سیر کرتے ہیں، مگر شیخ صاحب نے تو اپنے علاج کے لئے کشمیر سے باہر جانا بھی پسند نہیں کیا، ان کو وہاں کی حسین اور رنگین وادی، اور اس کی وزارتِ اعلیٰ کے گوشۂ عافیت میں جو ذہنی اور سیاسی سکون ملا، اُن کو شاید کہیں اور ملنے کی امید نہ تھی، اسی لئے وہ اپنی زبانِ حال سے یہ کہتے رہے،

قدم ز نقطۂ کشمیر بر نمی گیریم ۔۔۔ مقیم مرکز عیشیم و جائے ما اینجاست،

اور ان پر یہ اندرونی جذبہ کار فرما رہا،

کشمیر می ستانم از حق بجائے جنت ۔۔۔ اما نمی ستانم جنت بجائے کشمیر

مغربی بیروت میں صیہونیوں نے صابرہ اور شطیلہ کے فلسطینی کیمپوں میں گھس کر جو المناک قتلِ عام کیا ہے اس کی ہولناکی سے پوری دنیا چیخ اٹھی ہے، یہودیوں کی یہ سفاکی کوئی نئی نہیں، ان ہی نے حضرت عیسیٰ کو طرح طرح کی اذیتیں پہنچائیں، ان کی پشتِ مبارک پر چابک لگائے، ان کے ہاتھوں میں کیلیں ٹھونکیں، اور عیسائیوں کے عقیدہ کے مطابق تختۂ دار پر چڑھایا، پھر بھی تعجب ہے کہ امریکہ اور لبنان کے عیسائیوں کی اعانت سے یہی یہودی بیروت میں قیامتِ صغریٰ برپا کئے ہوئے ہیں اور یہ بھی باعثِ تعجب ہے کہ اب جب کہ بقول ایک شاعر فلسطینیوں کے اس قتلِ عام سے خود اجل کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دھار جاری ہے، اور اسلام کے خلاف ایک زبردست سازش پس دیوار جاری ہے، اس وقت عربوں میں باہمی تکرار، اُن کی محفل میں رقصِ بادۂ گلنار اور عشرت کدوں میں منتِ اغیار جاری ہے،

پھر بھی مسلمان یہ سمجھ رہے ہوں کہ اسرائیل کی زبردست قوت کی وجہ سے فلسطینی اور عرب ممالک ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے، تو وہ اپنے ایمان کی پختگی اور حرارت سے محروم ہیں، ان یہودیوں کو اسی سرزمین میں ختم ہونا ہے جب رات کو بیروت کے قتل عام کی خبر سُنی تو دوسرے دن فجر کی نماز کے بعد تلاوت کلام پاک میں یہ آیتیں نظر سے گذریں، جن کے ترجمے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے یہ کیے ہیں "ہم نے اپنی کتاب میں بنی اسرائیل کو اس بات پر متنبہ کر دیا تھا، کہ تم دو مرتبہ زمین میں فساد برپا کرو گے، اور بڑی سرکشی دکھاؤ گے آخر کار جب ان کی پہلی سرکشی کا موقع پیش آیا تو اے بنی اسرائیل! ہم نے تمھارے مقابلے پر اپنے ایسے بندے اٹھائے جو نہایت زورآور تھے، اور تمھارے ملک میں گھس کر ہر طرف پھیل گئے، یہ ایک وعدہ تھا جسے پورا ہو کر ہی رہنا تھا، اس کے بعد ہم نے تمھیں ان پر غلبے کا موقع دیا، اور تمھیں مال اور اولاد سے مدد دی، اور تمھاری تعداد پہلے سے بڑھا دی، دیکھو تم نے بھلائی کی تو وہ تمھارے اپنے ہی لئے بھلائی تھی، اور برائی کی تو وہ تمھاری اپنی ذات کے لئے برائی ثابت ہوئی، اور پھر جب دوسرے وعدہ کا وقت آیا تو ہم نے دوسرے دشمنوں کو تم پر مسلط کیا تاکہ وہ تمھارے چہرے بگاڑ دیں، اور مسجد (بیت المقدس) میں اسی طرح گھس جائیں جس طرح پہلے دشمن گھسے تھے، اور جس چیز پر ان کا ہاتھ پڑے، اسے تباہ کر کے رکھ دیں، ہوسکتا ہے اب تمھارا رب تم پر رحم کرے، لیکن اگر تم نے اپنی سابق روش کا اعادہ کیا تو ہم بھی اپنی سزا کا اعادہ کریں گے، اور کافر نعمت لوگوں کے لئے ہم نے جہنم کا قید خانہ بنا رکھا ہے"

(بنی اسرائیل رکوع ۱۰)

کلام پاک کی ان آیتوں پر یقین کامل رکھنا اپنے ایمان کا ثبوت دینا ہے، ضرورت صرف اس کی ہے کہ مسلمان اپنی زندگی میں اسلامی شعار کا اعادہ صحیح معنوں میں کریں، بارگاہ ایزدی میں دعا ہے

احساس عنایت کر آثار مصیبت کا،
امروز کی شورش میں اندیشۂ فردا دے

مقالات

گل رعنا

مؤلفہ مولانا حکیم سید عبدالحیٔ

از

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ناظم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

ہندوستان میں انگریزوں کے اقتدار اور جدید نظام تعلیم کے رائج ہونے سے پہلے ایک ہی نظام تعلیم رائج تھا، جو فارسی و عربی درسیات، زبان کے قواعد، ریاضی، منطق و فلسفہ، ادب (نثر و نظم)، بلاغت و فن عروض سے لے کر علوم دینیہ (فقہ، اصول و حدیث و تفسیر و علم کلام) پر مشتمل تھا، صدیوں تک ہندوستان میں ذہنی صلاحیتوں کے نشو و نما، فطری جوہر و ملکات کے چمکانے اور اعلیٰ ثقافت (کلچر) پیدا کرنے کا یہی واحد ذریعہ تھا، جس سے ملک کے انتظامیہ کے لیے اعلیٰ عہدیدار، یہاں تک کہ وزیر سلطنت، محاسب اعلیٰ (اکاؤنٹنٹ جنرل) جس کو عہد قدیم میں "مستوفی الممالک" کے نام سے یاد کرتے تھے، دبیر و منشی (انشا پرداز و سکریٹری) اور قاضی و مفتی یکساں طور پر پیدا ہوتے تھے، مستوفی الممالک مولانا شمس الدین خوارزمی (صدر و محاسب اعلیٰ بعہد غیاث الدین بلبن) خواجہ جہاں محمود گاواں گیلانی (وزیر سلطنت بیدر دکن) جملۃ الملک سعد اللہ خان علامی (وزیر شاہجہاں بادشاہ) اور تفضل حسین خاں علامہ (وزیر سلطنت اودھ) کے نام بطور نمونہ پیش کیے جاسکتے ہیں، جو سب اسی دور کی یادگار اور اسی طرز تعلیم کا نتیجہ تھے۔

اسی عہد میں جس طرح ہر طرح کے باصلاحیت تعلیم یافتہ افراد پیدا کرنے کے لیے جو ہر طرح کی ذمہ داری سنبھال سکیں، کوئی اور ذریعۂ تعلیم اختیار نہیں کیا جاتا تھا، اسی طرح ادب و انشا، تحریر و تصنیف، نقد سخن اور شاعری اور سخن سنجی کا مذاق اور سلیقہ پیدا کرنے کے لیے بھی کوئی متوازی نظامِ تعلیم یا اختصاص پیدا کرنے کا کوئی شعبہ موجود نہ تھا، جس طالب علم میں جس فن کی فطری صلاحیت اور خداداد مناسبت ہوتی تھی، یا اس کے مخصوص محرکات جمع ہو جاتے تھے، وہ اس میں امتیاز و اختصاص پیدا کر لیتا تھا اور اس کو اپنی زندگی کا مشغلہ بنا لیتا تھا، فارسی ادبیات کا اتنا وافر حصہ اور اس کے ایسے دلکش و دلآویز نمونے نصابِ تعلیم میں داخل تھے، اور بالعموم اساتذہ ان کو ایسی دلچسپی و دلسوزی سے پڑھاتے تھے[1] کہ بجز ان لوگوں کے جو فطری طور پر ذوق اور ادبی صلاحیت سے محروم ہوتے تھے، عام طور پر فارسی کا ذوق اور شعر و ادب سے لطف لینے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی تھی، اور چونکہ فارسی اور اردو کا گہرا تعلق ہے اس لیے اردو میں بھی اس سے بیش قیمت مدد ملتی تھی، اس زمانہ میں نصابِ تعلیم زندگی، ملک کی زبان و ادب اور مجالس و معاشرت سے الگ تھلگ کوئی چیز نہ تھی، جیسا کہ ۱۸۵۷ء کے بعد سے واضح طریقہ پر نظر آنے لگا، یہی باکمال اساتذہ جو مسندِ درس پر بیٹھ کر منطق و فلسفہ کی خشک و بے مزہ کتابیں پڑھاتے تھے اور علمی مباحث اور دقیق مضامین میں بال کی کھال نکالتے تھے، اور حدیث و تفسیر کے درس کے وقت وقار و تمکنت کی تصویر ہوتے، دوسرے وقت اپنے شہر و قریہ کی ادبی مجلسوں میں بے تکلف شریک ہوتے، اچھے شعر کی دل کھول کر داد دیتے، خود بھی طبع آزمائی کرتے اور شعر کا کھرا کھوٹا خوب پرکھتے، بلکہ اکثر اوقات انہی کا قول اس بارے میں

[1] قدیم نصابِ تعلیم میں عربی کے مقابلہ میں فارسی ادبیات کے نمونے اور اس کی نظم و نثر کا انتخاب بہتر تھا، اس لیے اس نصاب سے فارسی کا جتنا اچھا مذاق پیدا ہوتا تھا، اور اس میں انشا و تحریر کی جو صلاحیت پیدا ہوتی تھی، وہ عربی میں عام طور پر مفقود تھی۔

قولِ فیصل ہوتا، مولوی محمد حسین آزاد نے آبِ حیات میں اپنے استاد ذوق کے حالات میں لکھا ہے کہ ذوق نے اپنے استاد شاہ نصیر کی غزل پر غزل لکھی:

"شاہ صاحب کی طرف سے بجائے خود اس پر اعتراض ہوئے جشن قریب تھا، شیخ علیہ الرحمۃ نے بادشاہ کی تعریف میں ایک قصیدہ اس طرح میں لکھا، مگر پہلے مولوی شاہ عبدالعزیز صاحب کے پاس لے گئے کہ اس کے صحت و سقم سے آگاہ فرمائیں، انھوں نے سن کر پڑھنے کی اجازت دی، مگر ولی عہد بہادر نے اپنے شفقہ کے ساتھ اسے پھر شاہ صاحب کے پاس بھیجا، انھوں نے جو کچھ کہا تھا وہی جواب میں لکھ دیا اور یہ شعر بھی لکھا ؎

بود بگفتۂ من حرف اعتراض چناں کسے بدیدۂ بینا فرو برد انگشت

شیخ مرحوم کا دل اور بھی قوی ہو گیا اور دربارِ شاہی میں جا کر قصیدہ سنایا"[1]

۱۸۵۷ء اور اس کے کچھ عرصہ بعد تک جب تک ملک میں نیا نظامِ تعلیم رائج و مقبول نہیں ہوا تھا، ادبی و علمی محفلوں میں اسی قدیم نصاب کے ساختہ و پرداختہ فضلاء صدر نشین ہوتے، وہی زبان و ادب کی اس ملک میں سربراہی اور رہنمائی کا فرض انجام دیتے، انھی کا قول ان اصناف میں حجت مانا جاتا، انہی کے قلم سے ان مباحث پر بلند پایہ تصنیفات نکلتیں، اس لیے کہ پورے ملک میں یہی سب سے اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ تھا، ۱۸۵۷ء سے پہلے اور اس کے کچھ عرصہ بعد تک بھی مولوی امام بخش صہبائی، مولانا عبداللہ خان علوی، مفتی صدرالدین خان آزردہ اور مولانا فضل حق خیرآبادی جس طرح علوم معقول و منقول میں اپنے دور کے امام مانے جاتے تھے، اسی طرح نکتہ شناسی، دیدہ وری و سخن فہمی میں بھی معیار تسلیم کیے جاتے تھے اور ان کا قول حرفِ آخر اور زبان و ادب کے بارے میں بھی "فتویٰ" کی حیثیت رکھتا تھا، نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ جن کی سخن فہمی اور نکتہ رسی ان کے دور میں ایک ایسی

[1] آبِ حیات، مطبع کریمی لاہور، ص ۴۴۵۔

حقیقت بن گئی تھی کہ غالب تک کو یہ کہنا پڑا

غالب بہ فنِ گفتگو نازد بدیں ارزش کہ او
ننوشت در دیوان غزل تا مصطفےٰ خاں خوش نکرد

اسی نظامِ تعلیم کے فیض یافتہ و پروردہ تھے مولانا فضل حق خیرآبادی جو اس دورِ آخر میں علومِ عقلیہ کے امام مانے جاتے ہیں اور جن کا سارا وقت منطق و فلسفہ کی اعلیٰ کتابوں کی درس و تدریس اور ان کی موشگافیوں میں گذرتا تھا، اس پایہ کے سخن فہم و سخن شناس تھے کہ غالب نے ان کی خاطر اپنے اشعار (جو شاعر کے لیے اولاد کی طرح عزیز ہوتے ہیں) کے ایک بڑے حصہ پر خطِ نسخ پھیر دیا، مولانا حالی لکھتے ہیں کہ "مولانا کی تحریک سے مرزا نے اپنے کلام سے دو ثلث کے قریب اشعار نکال ڈالے اور اس کے بعد اس روش پر چلنا چھوڑ دیا[1]"

اس دور کے بعد بھی اسی طبقہ کے ہاتھ میں ملک کی علمی و ادبی قیادت رہی، مولوی محمد حسین آزاد، خواجہ الطاف حسین حالی، ڈپٹی نذیر احمد دہلوی اور علامہ شبلی نعمانی جن کو دورِ آخر میں زبان و ادب کی عمارت کے چار ستون کہنا بجا ہوگا، اسی طبقہ سے تعلق رکھتے تھے اور انھی کے قلم سے آبِ حیات، مقدمہ شعر و شاعری اور موازنۂ انیس و دبیر جیسی معرکۃ الآرا کتابیں نکلیں۔

مولانا حکیم سید عبدالحئی اسی دورِ واپسیں کی آخری یادگاروں میں تھے، انھوں نے جس عہد میں آنکھیں کھولیں اور ہوش سنبھالا، اس میں گھر گھر شعر و سخن کے چرچے تھے، شہروں کو چھوڑ کر جہاں مشاعرہ لازمۂ تمدن بن گیا تھا، قصبات اور بڑے دیہاتوں میں بھی مشاعرہ کی محفلیں آراستہ ہوتیں، اور نوجوان تو نوجوان، بچے تک شعر موزوں کرنے کی کوشش کرتے، ان کے والد مولوی سید فخرالدین صاحب خیالی جیسا کہ اس کتاب کے باب اول سے معلوم ہوگا، پرفکر شاعر اور کہنہ مشق نثار و ادیب تھے، مولانا سید عبدالحئی صاحب جب لکھنؤ میں تحصیلِ علم میں مشغول تھے، اس وقت منشی امیر احمد امیر مینائی، حکیم

---

[1] یادگارِ غالب۔

ضامن علی جلال، شیخ امیر اللہ تسلیم اور مولوی محمد محسن محسن کاکوروی کی شاعری کی دھوم مچی ہوئی تھی، ان میں سے بعض اساتذۂ سخن اگرچہ دربارِ رام پور سے متعلق ہو گئے تھے، لیکن وطنیت کے تعلق سے لکھنؤ کے در و دیوار ان کے اشعار کی تعریف و تحسین کے شور سے گونج رہے تھے، اور بچہ بچہ کی زبان پر ان کا نام اور کلام تھا، ادھر مرزا سلامت علی دبیر اور میر ببر علی انیس کے مراثی کی دھوم مچی ہوئی تھی، اور سارا شہر ان کے کلام سے مست ہو رہا تھا، وہ خود درد مند دل اور موزوں طبیعت لے کر آئے تھے، اردو تو ان کی زبان تھی، عربی و فارسی، ادب و زبان سے بھی انکو فطری مناسبت تھی، بھوپال گئے تو وہاں بھی والا جاہ امیر الملک نواب سید صدیق حسن خان بہادر (جو مفتی صدر الدین خاں آزردہ کے عزیز شاگرد تھے) کی جوہر شناسی اور قدر دانی سے شہرِ باکمال و صاحب ذوق علماء و ادباء کا مرکز بنا ہوا تھا، اور افتخار الشعراء حافظ محمد خاں شہیر، غلام احمد فرخ غنی اور متعدد نامی گرامی شعراء موجود تھے، اس ماحول اور اس انداز کی تعلیم و تربیت میں شعر و سخن کا ذوقِ سلیم اور سخن فہمی کا مذاقِ صحیح پیدا نہ ہونا تعجب ہے، چنانچہ یہ مذاق نہ صرف یہ کہ پیدا ہوا، بلکہ اس نے اس حد تک ترقی کی کہ ان کے قلم سے اردو شعراء کا ایک تذکرہ مرتب ہوا جو ان کی زندگی کے بعد "گل رعنا" کے نام سے شائع ہوا۔

ہندوستان میں ترکی و افغانی النسل فاتحین اور حکمرانوں کے اثر سے فارسی ہی تصنیفی و دفتری زبان قرار پائی، اور ۱۸۵۷ء کے کچھ بعد تک ہر قسم کا سنجیدہ علمی و تحریری کام یہاں تک کہ مراسلت، باپ بیٹوں اور دوستوں کی خط و کتابت بھی بالعموم اسی زبان میں ہوتی تھی، اس کا ایک نمونہ یہ ہے کہ اردو شعراء کے تذکرے ۱۸۵۷ء تک فارسی ہی میں لکھے گئے، یہ سب تذکرے اردو شاعری کے خد و خال، اس کی زبان کے نکتوں، اشعار کی نوک پلک اور شعراء کی امتیازی خصوصیات اور ان کے طرزِ کلام کو ظاہر کرنے کے لیے لکھے گئے، اور ان میں تمام تر ان کے اردو کلام کا نمونہ ہی پیش کیا گیا ہے، لیکن تذکروں کی زبان فارسی ہی ہے، چنانچہ میر تقی کی نکات الشعراء، میر حسن اور مصحفی کے تذکرے ....

مولوی قدرت اللہ کا طبقات الشعرا، فتح علی شاہ کا تذکرہ، اسی طرح سے بزم سخن، مہر جہاں تاب، اور حد یہ ہے کہ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کا گلشن بے خار سب فارسی ہی میں ہے۔

مولوی محمد حسین آزاد مرحوم کا یہ بہت بڑا علمی و ادبی کارنامہ اور اردو پر احسان ہے کہ آب حیات لکھ کر انھوں نے پہلی مرتبہ اردو والوں کو اردو شاعری کی کہانی اردو میں سنائی، وہ اردو زبان و ادب و شاعری کے گہوارہ میں پلے تھے، اور اردوئے معلیٰ کے اجڑنے سے پہلے اس کی بہار دیکھی تھی استاد ذوق جیسے استاد کے عزیز شاگرد تھے، ذوق، غالب، مومن، شیفتہ کی مجلسیں اور بے تکلف صحبتیں دیکھی تھیں، لکھنو بھی وہ اس وقت آئے جب ناسخ و آتش کے تذکروں سے محفلیں گرم اور دبیر و انیس کی خوش نوائی سے لکھنو کا چمن بول رہا تھا، سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ پیدائشی طور پر سخن فہم و سخن شناس تھے، ان کا خمیر شعر و ادب سے اٹھا تھا، اور اس کا ذوق ان کے رگ و ریشہ میں پیوست ہوگیا تھا، پھر وہ اس درجہ کے انشاء پرداز ہیں کہ ان کی انشاء پردازی دنیا کی دوسری ترقی یافتہ زبانوں کے کلاسیکل ادب اور ان کے ادبی شہ پاروں سے آنکھیں ملاتی ہے، ان کے سب سے بڑے ناقد مولانا حکیم سید عبدالحئی نے گل رعنا میں ان کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اور ان کے اس یگانہ کمال کا جس طرح اعتراف کیا ہے اس پر اضافہ مشکل ہے، وہ لکھتے ہیں:

"سب سے بہتر اور عمدہ تصنیف ان کی "آب حیات" ہے، جو اردو زبان اور ریختہ شعر کی تاریخ میں پہلی کتاب، اور اردو انشاء پردازی کا بہترین کارنامہ ہے، عبارت کی بے ساختگی اور برجستگی، اور اس میں شاعرانہ تخیل، استعاروں کی دلفریبی کے ساتھ ایسی چیز ہے جس پر غزلیں کے سیکڑوں دیوان قربان کر دینے کے قابل ہیں۔

اس کتاب کی مقبولیت کی بڑی دلیل یہ ہے کہ جو غلط اور نادرست روایتیں مصنف کے جادو نگار قلم نے لکھ دی ہیں، وہ آج اردو کی انشاء پردازی کے قالب میں روح کی طرح پیوست ہوگئی ہیں، اور ضرب المثل کی طرح زبانوں پر چڑھ گئی ہیں، جس طرح اقلیدس کے اصول موضوعہ بے چون و چرا مانے جاتے ہیں، اسی طرح ان کو بے تکلف کام میں لایا جاتا ہے[1]"

لیکن کوئی موضوع کسی بڑے سے بڑے مصنف پر ختم اور اس کے لیے وقف نہیں ہوتا، اور کوئی کتاب بھی (خواہ وہ کتنے ہی عظیم مصنف کے قلم سے نکلی ہو) اپنے فن و موضوع کی آخری کتاب قرار نہیں دی جاسکتی، علم و فن، فلسفہ و حکمت، شعر و ادب، صناعی و معماری، مصوری و نقاشی، اختراع و ایجاد سب کی وسعت و ترقی کا راز اسی نکتہ میں ہے کہ ان کے کسی نقش کو نقش دوام اور ان کی تحقیق کو حرف آخر قرار نہیں دیا گیا اور حوصلہ مند مصنفین اور نیک نیت ماہرین فن اور علم و تحقیق کی سچی لگن رکھنے والے اہل قلم نے اپنے پیشروؤں کے فضل و کمال اور ان کی اولیت کا اعتراف کرتے ہوئے ان کا علمی محاسبہ بھی کیا، اور تحقیق کا ایک قدم آگے بڑھانے اور ان کے معلومات کے اندوختہ میں اضافہ کرنے کی جرأت کی، یہ دنیا کی کسی زبان اور کسی علم و فن کی تاریخ میں کبھی بھی گناہ یا شوخی و گستاخی نہیں قرار دی گئی، بلکہ ہر نئی نسل کے بساط علم و تحقیق کے تازہ واردوں کے کان میں ہمیشہ یہی غیبی آواز آتی اور ان کا دل بڑھاتی رہی ہے

گماں مبر کہ بپایاں رسید کار مغاں   ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک است

"آب حیات" بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں، وہ اپنی غیر معمولی مقبولیت اور اپنی اعلیٰ انشاء پردازی دقیق نکتہ سنجی، بلکہ ذوق آفرینی اور ادب آموزی کے ساتھ ہر انسانی کام کی طرح نقائص سے یکسر مبرا اور غلطیوں اور فروگذاشتوں سے کلیۃً خالی نہ تھی، مولانا آزاد پیدائشی اور خلقی طور پر ادیب تھے، اور ادب و حسن انشاء ان کے تیغ قلم کا اصل جوہر ہے، ادبی مزاج اور تاریخی مزاج میں ایک طرح کا بُعد اور ادبی تقاضوں اور تاریخی تقاضوں میں بعض اوقات تعارض پایا جاتا ہے، ادب تخیل پسند

---

[1] گل رعنا" ص ۴۷۰ طبع چہارم ۱۳۷۰ھ، ۱۹۵۱ء۔

ہوتا ہے اور تاریخ حقیقت پسند، ادب اپنی پرواز کے لیے آزاد اور بے قید فضا چاہتا ہے، تاریخ اپنے سفر کے لیے ایک محدود اور بنا تلا راستہ، ادب تشبیہ اور استعارہ اور تخیل سے آب و رنگ پیدا کرتا ہے اور تاریخ حوالوں، واقعات اور قدیم تحریروں کی پابندی سے گرانبار ہوتی ہے، مولانا آزاد کا اصل مزاج اور رجحان طبیعت ادب و انشا پردازی ہے، وہ خواہ کسی تاریخی موضوع پر قلم اٹھائیں، یہ ذوق ان پر غالب آکر رہتا ہے، اس کی مثال دیکھنا ہو تو دربار اکبری کا مطالعہ کیا جائے۔

آب حیات کے ان تشنہ گوشوں کو جو ایک نئی تصنیف کے متقاضی تھے، ہم تین قسموں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

(۱) آب حیات میں جن شعراء کا تذکرہ ہے، بہت خوب ہے، اور آزاد نے ان کے بارے میں اپنی سخن شناسی اور ذوق کی لطافت کا پورا ثبوت دیا ہے، لیکن ہر دور کے شعراء کی ایک بڑی تعداد جن میں سے بہت سے ان شعراء کے ہم پایہ تھے جن کا تذکرہ آب حیات میں آیا ہے، اور بعض اپنے ان خوش قسمت معاصرین سے جن کا آب حیات میں تذکرہ آگیا ہے، بلند پایہ تھے، نظر انداز ہو گئی ہے، ان کے تذکرہ کے بغیر اردو شاعری کی مسلسل تاریخ میں بیچ بیچ میں خلا محسوس ہوتے ہیں، اور بعض اہم کڑیاں مفقود نظر آتی ہیں۔

مثلاً طبقۂ متقدمین میں سے مولانا نصرتی، فقیر اللہ آزاد، میر سراج الدین سراج، مرزا داؤد داؤد، میر عبدالولی عزلت، عارف الدین خان عاجز اور محمد حسین کلیم نظر انداز ہو گئے ہیں، ان میں سے بعض کا کلام بالخصوص میر سراج الدین سراج کے اشعار صفائی زبان کا نمونہ اور اردو شاعری کی ترقی و پیش رفت کے اظہار کے لیے سنگ میل کا درجہ رکھتے ہیں، اور مرزا مظہر جان جاناں اور خواجہ میر درد کے کلام سے لگا کھاتے ہیں، نیز دور متوسطین میں انعام اللہ خان یقین

میر محمد باقر حزیں، میر محمد بیدار، میر قدرت اللہ قدرت، میر ضیاء الدین ضیاء، حکیم ثناء اللہ خان فراق، میر نظام الدین ممنون، بہادر شاہ ظفر، نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ، کرامت علی شہیدی کا تذکرہ موجود نہیں، شیخ قیام الدین قائم اور شیخ بقاء اللہ بقا کا تذکرہ حاشیہ میں چند چند سطروں میں آیا ہے ان میں سے یقین، ممنون، ظفر، شیفتہ[1] کسی طرح آزاد کے سے جوہر شناس اور کمال کے سچے قدر دان کی قدر دانی سے محروم ہونے کے لائق نہ تھے، اور سہو یا تغافل کی توجیہ اس حالت میں آسان نہیں کہ اس تذکرہ میں میر ضاحک اور میر مستحسن خلیق جیسے شعراء موجود ہیں، جن کے دو دو چار چار شعر سے زیادہ آزاد کو نہ مل سکے اور نہ انھوں نے اپنے عہد اور ادبی رجحانات پر کوئی اثر ڈالا، متاخرین کے دور کو لو تو خواجہ محمد وزیر وزیر، میر وزیر علی صبا، نواب سید محمد خاں رند، مرزا محمد رضا برق، میر علی اوسط رشک، مرزا اصغر علی خاں نسیم، میر مظفر علی اسیر، شیخ امداد علی بحر قلم انداز ہو گئے ہیں، اور اسی طرح لکھنؤ کے اُن نامی گرامی شعراء کے تذکرہ سے آب حیات خالی ہے جن کا اس عہد میں طوطی بولتا تھا، اور جو دور دور شہرت و مقبولیت حاصل کر چکے تھے، اسی طرح منشی امیر احمد امیر مینائی، نواب مرزا خاں داغ، مرزا قربان علی سالک، میر مہدی مجروح اور حکیم ضامن علی جلال اس بزم میں نظر نہیں آتے، جن کی شاعری سے نہ صرف لکھنؤ بلکہ رام پور، حیدرآباد اور خود دہلی کی مجلسیں معمور و مخمور تھیں، اس موقع پر یہ عذر نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی شاعری کے شہپر نے آزاد کی وفات کے بعد بال و پر نکالے، اور انھوں نے ارتقاء کے منازل طے کیے، اس لیے کہ یہ سب وہ ہیں جو شاعری کی دنیا میں نام پیدا کر کے آزاد کی وفات (۱۳۲۷ھ، ۱۹۰۸ء) سے کئی کئی سال پہلے اس دنیا سے سفر اختیار کر چکے تھے، اور آزاد جیسا اردو ادب و شاعری کا قدر دان اور مبصر ان سے

---

[1] نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کا صرف نام اور ولدیت مومن خاں کے تذکرہ میں آگئی ہے اور اس کا ذکر ہے کہ وہ گلشن بے خار کے مصنف ہیں۔

بے خبر نہیں ہو سکتا، اسی طرح سے آزاد نے انیسؔ و دبیرؔ کا تذکرہ دل لگا کر کیا ہے، اور ان کی معنی آفرینی، نازک خیالی اور بلند پروازی اور شکوہ الفاظ کی دل کھول کر داد دی ہے، لیکن انھی اوصاف میں مولوی محمد محسن کاکوروی بھی ان سے کسی طرح کم نہیں، جن کے متعلق امیر مینائی کہتے ہیں کہ

"ان کا کلام ایک عالم ہے خیالاتِ نادرہ کا کہ اس کو دیکھ کر انسان حیران ہو جاتا ہے، اور ان کا ہر شعر معراج بلاغت ہے"[1]۔

ان کی نظمیں صبح تجلی، چراغ کعبہ اور سراپا وغیرہ کے بند پڑھے جائیں تو وہ نازک خیالی، مضمون آفرینی، تشبیہات و استعارات کی تازگی اور لطیف تلمیحات میں کسی طرح سے انیسؔ و دبیرؔ سے کم نہیں، فرق یہ ہے کہ انھوں نے اپنی ساری ذہانت و محنت نعت نبویؐ اور مدح خیر المرسلینؐ میں صرف کی، اور انیسؔ و دبیرؔ نے مرثیہ و منقبت، مصائب اہل بیت اور واقعۂ کربلا کے بیان کرنے میں جس سے آزاد کے دل کو زیادہ لگاؤ اور وابستگی تھی، اپنی ذہانت اور قوت شاعری صرف کی۔

اسی طرح سے آب حیات اپنے مصنف کے دور تک بھی اردو شاعری کے تمام عہدوں کے باکمال شعراء کے پورے تذکروں پر حاوی نہ تھی، اور بہت سے ایسے شعراء و اساتذہ نظر انداز ہو گئے، جو نظر انداز ہونے کے قابل نہ تھے۔

اسی طرح آزاد کی آخری زندگی اور اُن کی وفات کے بعد خواجہ الطاف حسین حالی، مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی، لسان العصر میر اکبر حسین الٰہ آبادی نے اردو شاعری میں ایک نیا رنگ اور نیا آہنگ پیدا کیا، خود مصنف آب حیات مولوی محمد حسین آزاد بھی اس کے مستحق تھے کہ ان کو اس بزم میں جگہ دی جائے اور اردو شعراء کا تذکرہ جو ان کی وفات کے بعد لکھا گیا ہو، ان کے تذکرہ سے خالی نہ ہو، اس لیے ایک ایسی تصنیف کی ضرورت تھی جو اس کمی کو پورا کرے اور اس عہد تک کے لیے ایک جامع تذکرہ

[1] مقدمہ مکتوبات امیر مینائی۔

کہلانے کی مستحق ہو۔

(۲) "آب حیات" میں متعدد تاریخی فروگذاشتیں پائی جاتی ہیں، اور بعض ایسے بیانات ہیں جن کی تصدیق ان اصل کتابوں سے نہیں ہوتی جن کا حوالہ دیا گیا ہے، اس کی وجہ یا تو یہ ہے کہ آزاد نے ان کے بارے میں سنی سنائی روایات پر یا اپنے حافظہ پر اعتماد کیا، اور کتاب کی تصنیف کے وقت اصل ماخذ کی طرف رجوع کرنے کی زحمت گوارہ نہیں کی، یا ان کتابوں کے کسی گوشہ اور نقطہ کو اپنے گوہر بار قلم اور قوت متخیلہ سے بڑھا چڑھا کر کہیں سے کہیں پہونچا دیا، وہ زمانہ کتابوں کی کمیابی کا تھا، اس لیے کوئی حیرت و استعجاب کی بات نہیں کہ اردو کے بعض بنیادی تذکرے ان کی نظر سے نہ گذرے ہوں، مثلاً اب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ گئی ہے کہ میر تقی میرؔ کا تذکرہ نکات الشعراء ان کی نظر سے نہیں گذرا، اور اس کے لیے آب حیات میں داخلی شہادتیں موجود ہیں، غالباً سب سے پہلے نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی نے "نکات الشعراء" (جس کو انجمن ترقی اردو نے نظامی پریس بدایوں سے شایع کیا) کے مقدمہ میں اس کو وضاحت اور قوت کے ساتھ ظاہر کیا،[1] اور آب حیات اور نکات الشعراء میں متعدد مقامات میں تضاد ظاہر کر کے آخر میں لکھا ہے:

"میری بدگمانی معاف ہو تو میں کہوں گا کہ نکات الشعراء آزاد کی نظر سے نہیں گذرا، قیاس کی بلند پروازی نے طوطی مینا بنا کر اڑائے ہیں اور ان کی سحر بیانی نے سامعین کو خوش کیا ہے"[2]۔

یہاں اس کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

(۱) آزاد کہتے ہیں کہ "میر صاحب دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ یہ اردو کا پہلا تذکرہ ہے، اس میں ایک ہزار شاعروں کا حال لکھوں گا، مگر ان کو نہ لوں گا جن کے کلام سے دماغ پریشان ہو" دیباچہ میں کہیں نہیں ہے کہ اس میں ایک ہزار شاعروں کا تذکرہ لکھوں گا، یہ بھی نہیں ہے کہ ان کا ذکر نہیں لکھوں گا،

[1] ملاحظہ ہو آب حیات" اور نکات الشعراء، نکات الشعراء ص ۲۰ تا ۲۴ [2] نکات الشعراء (مقدمہ) ص ۲۴۔

جن سے دماغ پریشان ہو۔ "نکات الشعراء" کے مطبوعہ نسخہ میں صرف ایک سو دو ۱۰۲ شعراء کا تذکرہ ہے۔

(۲) آزاد لکھتے ہیں کہ ان ہزار میں سے ایک بے چارہ بھی طعنوں اور ملامتوں سے نہیں بچا، نکات الشعراء کے مطالعہ سے اس کی بالکل تصدیق نہیں ہوتی، بلکہ اس کے خلاف ان کی فراخ دلی، صاف دلی اور وسیع المشربی کا برملا ثبوت ملتا ہے، وہ اعتراف کمال، تحسین سخن شناس کی روشن مثالوں سے بھرا ہوا ہے۔

(۳) آزاد نے لکھا ہے کہ ولی کہ بنی نوعِ شعراء کا آدم ہے، اس کے حق میں فرماتے ہیں:

"وے شاعریست از شیطان مشہور تر" (آب حیات ص ۱۹۵ مطبوعہ مفید عام پریس ۱۸۹۹ء)

یہ فقرہ نکات الشعراء میں کہیں موجود نہیں، اس کے بجائے نکات الشعراء میں یہ الفاظ پائے جاتے ہیں: "از کمال شہرت احتیاج تعریف ندارد"

(۴) آزاد نے آب حیات میں لکھا ہے کہ میر صاحب نے میر سوز کو پادشاعر مانا ہے، ایک خود، ایک مرزا رفیع، آدھے خواجہ میر درد، پاؤ میر سوز، مصنف گل رعنا لکھتے ہیں کہ یہ آزاد کی صرف بذلہ سنجی ہے، نکات الشعراء میں خواجہ میر درد اور میر سوز کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ اس کے بالکل برخلاف ہے، اسی طرح ان کے تخلص کے متعلق جو لطیفہ آب حیات میں ہے، نکات الشعراء سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی، میر صاحب نے ان کے تخلص کی تبدیلی کے واقعہ کو ممنونیت اور بزرگانہ انداز سے بیان کیا ہے۔

اسی طرح آزاد نے میر صاحب کی بد دماغی و نازک مزاجی کی جو تصویر کھینچی ہے، اور نواب سعادت علی خاں کا سامنا ہو جانے اور ان کی بے پروائی اور بے نیازی کا جو نقشہ بیان کیا ہے، پھر خلعت بحال کرنے اور دعوت کا ایک ہزار روپیہ بھیجنے اور رد و کد کے بعد قبول کرنے کا جو واقعہ بڑھا چڑھا کر بیان کیا ہے، اس کی واقعات سے تصدیق نہیں ہوتی، مصنف گل رعنا نے میر صاحب کے ایک ہمعصر مرزا لطف علی کی کتاب "گلشن ہند" کے حوالہ سے ثابت کیا ہے کہ ان کا مشاہرہ کبھی موقوف نہیں ہوا اور ۱۲۱۵ھ تک

ان کا یہی حال رہا، انھوں نے ثابت کیا ہے کہ ۱۲۱۵ھ میں جب میر صاحب کی تنخواہ جاری تھی، خود انشاء اللہ خاں کی رسائی پہلی مرتبہ نواب سعادت علی خاں کے دربار میں ہوئی، اس لیے درایۃً بھی یہ واقعہ صحیح نہیں، انھوں نے ان تمام واقعات پر، جو میر صاحب کی طرف منسوب کیے گئے ہیں تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"حقیقت یہ ہے کہ آزاد نے میر صاحب کی جو تصویر آب حیات میں کھینچی ہے، وہ ان کے منھ پر کھلتی نہیں، کچھ شبہ نہیں، میر صاحب نازک مزاج تھے، مگر آزاد نے جو واقعات لکھے ہیں، اگر آج وہ کسی میں پائے جائیں تو ہر شخص اس کو نازک مزاج نہیں "خبط دماغ" سمجھے گا۔"[1]

آزاد کی واقفیت اودھ کی تاریخ سے زیادہ گہری اور وسیع نہیں، اور یہ کوئی قابل تعجب بات نہیں کہ اودھ کی تاریخ کا مواد ان کو نہ ملا ہو، اس لیے ان کے قلم سے بعض ایسی روایتیں نکل گئی ہیں، جو محض ناواقفیت اور سطحی معلومات پر مبنی ہیں، مصنف گل رعنا لکھتے ہیں:

"آزاد کہتے ہیں کہ (سودا) ۱۱۸۵ھ میں لکھنؤ پہونچے، نواب شجاع الدولہ نے بے تکلفی یا طنز سے کہا، مرزا! تمھاری وہ رباعی اب تک میرے دل پر نقش ہے، یہ پاس وضعداری پھر دربار نہ گئے، یہ سب افسانہ ہے، شجاع الدولہ فیض آباد میں رہتے تھے، لکھنؤ کی اس وقت ایک قصبہ سے زیادہ حیثیت نہ تھی، یہ بھی غلط ہے کہ وہ دلی سے براہ راست یہاں آئے، یہ بھی غلط ہے کہ سودا ایک بار کے سوا پھر دربار نہیں گئے، شجاع الدولہ جب تک جیتے رہے، یہ ان کی ملازمت میں رہے، ان کے کلیات میں متعدد قصیدے شجاع الدولہ کی تعریف میں موجود ہیں، مصحفی اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں

"ہر جا کہ می رفت عزت و حرمت تمام می یافت، نواب مرحوم و مغفور نیز بودن او را در سرکار خود غنیمت می دانستند"[2]

---

[1] حاشیہ گل رعنا ص ۱۵۹۔۱۶۰ طبع چہارم [2] گل رعنا ص ۱۳۹، طبع چہارم۔

صرف نکات الشعراء ہی نہیں اندازہ ہوتا ہے کہ آزاد کی نظر سے مصحفی کا تذکرہ بھی نہیں گزرا، یا کم از کم آب حیات کی تصنیف کے وقت وہ پیش نظر نہیں تھا، انھوں نے سید انشاء کے اس زمانہ کا نقشہ کھینچتے ہوئے جب اقبال نے ان سے منھ موڑ لیا تھا اور ان کے ولی نعمت (نواب سعادت علی خاں) کی نگاہیں ان سے پھر گئی تھیں، مرزا سعادت یار خان رنگین سے نقل کیا ہے کہ "تیسری بار گیا تو ان کو ایک مشاعرہ میں اس طرح دیکھا کہ ایک شخص میلی کچیلی روئی دار مرزئی پہنے، سر پہ ایک میلا سا پھیٹا، گھٹنا پاؤں میں، گلے میں پیکو کا توبڑا ڈالے ایک گگرا کا حقہ ہاتھ میں لیے آیا، توبڑہ میں سے ایک کاغذ نکالا، غزل پڑھی اور کاغذ پھینک چل دیا" اس موقع پر آزاد نے انشا کی وہ غزل لکھی ہے جس کا مطلع ہے ؎

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

مصنف "گل رعنا" اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"آزاد نے انشا کی وہ مشہور غزل اس جگہ نقل کی ہے جو اس موقع کے لیے نہایت موزوں ہے، اور اس کا ایک شعر یہ ہے:

نہ چھیڑ اے نکہت باد بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹھکیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

مگر واضح ہے کہ یہ غزل انشا کی اس زمانہ کی تصنیف نہیں جو ان کے جنون اور بے چارگی کا زمانہ بیان کیا جاتا ہے، میں نے اس غزل کے چند اشعار تذکرہ مصحفی میں پڑھے ہیں جو اس زمانہ میں لکھا گیا ہے جس وقت انشا لکھنؤ پہونچے بھی نہ تھے، مصحفی نے تذکرہ میں وہاں تک کا حال لکھا ہے کہ مرشد آباد سے دلی آچکے ہیں اور مرزا عظیم بیگ وغیرہ شعرائے دلی سے معرکے در پیش تھے"[1]

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:

[1] حاشیہ گل رعنا ص ۲۶۲، طبع چہارم۔

"آزاد نے انشا کے مجنون ہو جانے اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے کی ایسی دردانگیز تصویر کھینچی ہے کہ اس کو انھی کے الفاظ میں پڑھو تو دل بے قابو ہو جاتا ہے، اور حقیقت میں دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے، مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ آزاد کی نرالی جادو طرازی ہے "حیات میر" کے مصنف نے مرزا اوج کی زبانی لکھا ہے جو میر انشا کے نواسے تھے کہ سید انشا نہ مجنون ہوئے، نہ ان کی تنخواہ بند ہوئی، صرف اتنا صحیح ہے کہ نواب سعادت علی خان نے حکم دے دیا تھا کہ وہ سوا دربار کے اور کہیں نہ آئیں جائیں، اور دربار بھی اس وقت حاضر ہوں جب ان کو بلایا جائے، انشا نے اس حبس بے جا کی طرف اس شعر میں اشارہ کیا ہے ؎

بدون حکم وزیر الممالک اے آغا
چساں کنم حرکت نوکری ست یا بازیست[1]

یہ اُن چند تاریخی فروگذاشتوں اور غیر محتاط یا مبالغہ آمیز تصویر کشی کی چند مثالیں ہیں جو آب حیات کے صاف آئینہ پر دھبہ کی طرح نمایاں ہوتی ہیں، اور ان کی تحقیق اور اصل واقعہ کا اظہار ہر اس دیانتدار مورخ کا فرض تھا جو اس موضوع پر آزاد کے بعد قلم اٹھاتا، اور ہمارے علم میں گل رعنا میں سب سے پہلے اس فرض کو انجام دینے کی کوشش کی گئی۔

(۳) آب حیات میں اساتذۂ سخن کے تذکرے، ان کے محاسن و کمالات کا اعتراف و اظہار اور ان کے مرتبہ و مقام کے تعین، نیز بعض ہمعصر اور باہم دیگر مقابل شعراء کے موازنہ کے بارے میں کچھ ایسی خامیاں پائی جاتی ہیں جن کو ہم اگر آزاد کے احترام اور ان کے فضل و کمال کے اعتراف میں "ناانصافیاں" نہ کہیں تو "ناہمواریاں" ضرور کہہ سکتے ہیں، متعدد مقامات پر ان کے مذہبی جذبات یا ذاتی تعلقات غیر جانبدارانہ تاریخ نویسی کے تقاضوں پر غالب آگئے ہیں، اس بے اعتدالی کا سب سے زیادہ احساس مرزا مظہر جان جاناںؒ کے تذکرہ کے موقع پر ہوتا ہے، مرزا صاحب ہندوستان کی ان

[1] گل رعنا ص ۲۶۲، طبع چہارم۔

باکمال ہستیوں میں ہیں جن کے وجود پر اس سرزمین کو فخر ہے، بہت سے اہلِ بصیرت کے نزدیک سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ میں مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندیؒ کے بعد ان کے پایہ کا بزرگ نظر نہیں آتا، ان کے نامور اور صاحبِ نظر معاصر حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ دہلوی جو خود یگانۂ روزگار تھے، ان کے متعلق لکھتے ہیں:

"ہمارے اس دور میں ان ملکوں میں (جن سے ہم واقف ہیں) کسی ملک میں ان کا ہمسر پایا نہیں جاتا دورِ ماضی اور بزرگانِ سلف میں اس کا سراغ لگ سکتا ہے، بلکہ سچ پوچھو تو ہر زمانہ میں ایسے بزرگ زیادہ تعداد میں پائے نہیں جاتے، چہ جائیکہ ایسے زمانہ میں جو فتنہ و فساد سے پُر ہے۔"[1]

آزاد نے ان کے تذکرہ میں نہ صرف ان کے مرتبہ و مقام کا لحاظ نہیں رکھا، بلکہ ان ہزاروں، لاکھوں مسلمانوں کے جذبات کا بھی احترام نہیں کیا جو ان کے عقیدت مند اور حلقہ بگوش تھے، اول تو ان کی نازک مزاجی کو اس انداز سے پیش کیا جس سے نہ صرف ان کی غیر واقعی تصویر نگاہوں کے سامنے آتی ہے، بلکہ میر صاحب سے بھی کچھ آگے بڑھ کر وہ ایک نہایت تنگ مزاج، مغلوب الغضب اور غیر مہذب انسان کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں، اس میں آزاد نے صرف رنگ آمیزی ہی سے کام نہیں لیا، بلکہ اس میں مذہبی جذبات کی بھی (جو افسوس ہے کہ اکثر حقائق پر پردہ ڈال دیتے ہیں) جھلک پیدا ہو گئی ہے، پھر ان کی طرف بعض ایسے واقعات منسوب کیے ہیں جو ان کے مرتبہ کے دینی پیشوا اور مقتدائے خلائق سے قطع نظر ایک خوش وضع اور ثقہ آدمی کے مرتبہ سے بھی مناسبت نہیں رکھتے۔

مصنف گل رعنا نے جو آزاد کے برخلاف تصوف و صوفیہ کی تاریخ ان کے مزاج و مذاق سے زیادہ آشنا اور مراتب رجال سے زیادہ واقف ہیں اور جن کو براہ راست مرزا صاحب کے افادات و تحقیقات، ان کے علوم عالیہ و مضامین نادرہ پڑھنے اور ان کے متعلق ان کے معاصرین کی

---

[1] کلمات طیبات ص ۱۶۴ - ۱۶۵۔

شہادتوں سے واقف ہونے کا موقع ملا ہے، اس طرز نگارش پر احتجاج آمیز تنقید کی ہے، جو انھی کی نہیں، ان لاکھوں مسلمانوں کے دلی جذبات کی ترجمانی ہے جو مرزا صاحب کے ہم عقیدہ اور عقیدت مند ہیں، وہ مرزا صاحب کے حالات و کمالات کا تذکرہ کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"افسوس ہے کہ شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد نے حسب معمول ان کے حالات بیان کرتے میں چٹکیاں لی ہیں، کہیں واقعہ کی صورت ایسی بنائی ہے جس سے بجائے مدح کے ذم کا پہلو نکلتا ہے، ایک جگہ فرماتے ہیں کہ "ان کے باب میں بہت سے لطایف ایسے مشہور ہیں کہ اگر آج کسی میں پائے جائیں تو زمانہ کے لوگ اچھا نہ سمجھیں، کچھ تو اس اعتقاد سے کہ خطائے بزرگاں گرفتن خطاست اور کچھ میں روسیاہ بزرگوں کی ہر بات کو چشم عقیدت کا سرمہ سمجھتا ہوں"..... الخ (ص ۱۳۰) تاباں کا حال جیسا چٹکا کر لکھا ہے، اور سرگوشیوں کا فسانہ جس طرح بیان کیا ہے، وہ بھی ملاحظہ طلب ہے، (ص ۱۳۹) شعر مندرجہ (ص ۱۰۴) کو پڑھیے، پھر مرزا صاحب جیسے مہذب کو اور آزاد کی معذرت کو دیکھیے، فرماتے ہیں کہ "تہذیب آنکھ دکھاتی ہے، مگر کیا کیجیے ایشیا کی شاعری کہتی ہے کہ یہ میری صفائی زبان اور ظرافت کا نمک ہے" (ص ۱۴۰) مرزا رفیع سودا کی ہجو پر حاشیہ چڑھاتے ہیں کہ ایک دھوبن گھر میں ڈال لی تھی"[1] (ص ۱۴۲)

اس کے بعد ان واقعات کی حقیقت بیان کرتے ہوئے جو آزاد نے دوسرے رنگ سے بیان کیے ہیں، اور یہ ثابت کرنے کے بعد کہ واقعات کو غلط شکل میں پیش کیا گیا ہے، لکھتے ہیں:

"اصل یہ ہے کہ مولانا آزاد نے مرزا صاحب کو آب حیات میں ناخواستہ طبیعت جگہ دی ہے، جیسا کہ ان کے انداز بیان سے معلوم ہوتا ہے، وہ جوش و خروش اور کثرت کلام ڈھونڈتے ہیں، جو یہاں نہیں ملتا۔"[2]

---

[1] گل رعنا ص ۱۲۹ - ۱۳۰ [2] ایضاً ص ۱۳۱

اس پر تبصرہ کرتے ہوئے حاشیہ میں لکھتے ہیں:

"یہاں تو نہیں، مگر میر ضاحک اور میر خلیق کے یہاں کیا مل گیا، میر ضاحک کا ایک شعر اور میر خلیق کے دو شعر ہاتھ آئے، مگر ان کے حالات لکھنے کی بے چینی ملاحظہ ہو، میر ضاحک کے حالات میں فرماتے ہیں" ابتدا سے دل چاہتا تھا کہ اس خانوادۂ سیادت کا سلسلہ مسلسل لکھوں، مگر پھول نہ ہاتھ آئے جو لڑی پروتا...... اب کہ طبع ثانی کا موقع ہے آرزوئے قدیم پھر دل میں لہرائی، ناچار برسوں کے سوکھے مرجھائے پھول دلِ افسردہ کے طاق میں پڑے ہوئے تھے، انھیں کا سہرا بنا کر ساداتِ عظام کے روضوں پر چڑھاتا ہوں" (آبِ حیات ص ۱۶۷)[1]

اس کے بعد وہ مرزا صاحب کے بارے میں میر صاحب اور مصحفی جیسے نقادِ سخن کی شہادتیں اور اعتراضات نقل کرتے ہیں، اور ان کے کلام پر تبصرہ کرتے ہیں، اسی افسردگی اور بے دلی کی وجہ سے آزاد نے مرزا صاحب کے صرف تین اشعار نمونے کے طور پر پیش کیے ہیں، مصنف گل رعنا نے ان کے کلام کا زیادہ سے زیادہ نمونہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے، اور غالباً مرزا صاحب کے اتنے اردو اشعار یکجا کسی تذکرہ میں نہیں آئے ہیں، یہ تعداد میں اکتالیس ہیں۔

مصحفی اور انشا کے تقابل میں پھر یہی اندرونی جذبہ ابھر کر سامنے آگیا ہے، آزاد سے نقاد، سخن فہم اور اردو شاعری کے ادا شناس اور مزاج داں سے بالکل اس کی توقع نہیں تھی کہ وہ مصحفی جیسے مسلّم الثبوت استاد اور صاحبِ طرز شاعر پر جن کے کمالات و فتوحات کی سرحدیں بارہا میر اور سودا کی سرحدوں سے مل گئی ہیں، اور ان کے بعض اشعار صرف اردو شاعری میں نہیں، بلکہ مطلق شاعری کی تاریخ اور اس کے منتخب اشعار میں جگہ پانے کے مستحق ہیں، سید انشا کو ترجیح دیں گے، جن کے متعلق دورِ آخر کے سب سے بڑے مبصر نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ نے بجا طور پر لکھا ہے کہ "ہیچ صنف را بطریقہ شعراء سخن

[1] حاشیہ گل رعنا ص ۱۳۱

نگفتہ" اور جن کے متعلق خود انھوں نے لکھا ہے کہ "ان کی بے اعتدالیاں کچھ جہالت کا سبب نہ تھیں بلکہ عمداً تھیں یا بے پروائی کی وجہ سے تھیں کہ اپنی طبع وقاد اور جامعیت استعداد کے سامنے قواعد اور اہل قواعد کو خاطر میں نہ لاتے تھے" آگے لکھتے ہیں کہ "انھوں نے الفاظ اور محاورات میں بہت سے تصرف کیے، یہ تصرف اگر صرف محدود مقاموں میں ہوتے تو شکایتیں نہ ہوتیں، کیونکہ اس زبان اور سے زیادہ قادر زبان اور زبان داں کون ہے؟ خصوصاً جب کہ استعداد علمی سے مسلح ہو، لیکن افراط نے ہمیں بھی خاموش کر دیا ہے"[1]

آخر وہی ہوا کہ زمانہ نے جس کے متعلق انھوں نے بلیغ انداز میں لکھا ہے کہ "وقت حاکم جابر ہے اور پسند عام اس کا واضع قانون ہے" اپنا فیصلہ صادر کر دیا، سید انشا کی ہنگامہ خیزیاں، بزم آرائیاں اور بذلہ سنجیاں ان کے ساتھ گئیں، اور ان کے کلام کا بیشتر حصہ بھی..... اپنے ساتھ لے گئیں، مصحفی کا کلام باقی ہے اور زمانہ جتنا گذرتا جاتا ہے اس کی آب و تاب بڑھتی جا رہی ہے، اور تحقیق و تحسین کے نئے نئے گوشے پیدا ہوتے جا رہے ہیں، آبِ حیات کا یہ حصہ جس میں ان دونوں کا محاکمہ ہے اور لکھنؤ کی معرکہ آرائیوں کی موئے قلم سے تصویر کھینچی گئی ہے، ان کے ذاتی رجحان اور اندرونی جذبہ کی صرف غمازی نہیں آئینہ داری کرتا ہے، جو آزاد جیسے بے لاگ جوہری کے شایانِ شان نہیں۔

اسی طرح صرف مرزا مظہر جانِ جاناں ہی نہیں مومن خاں جیسے استاد کا تذکرہ بھی جو ایک مستقل دبستان کے بانی اور مسلّم الثبوت استاد ہیں، انھوں نے با دل ناخواستہ اور غالباً لوگوں کے توجہ دلانے سے کیا ہے، چنانچہ آبِ حیات کے پہلے ایڈیشن میں..... مومن خاں کا تذکرہ نہ تھا، اس کی انھوں نے بعد کے ایڈیشن میں جو توجیہ کی ہے وہ نظر میں جچتی نہیں، مومن خاں جیسے نامور شاعر کے

[1] آبِ حیات ص ۲۰۳ - ۲۰۴، مطبع کریمی لاہور۔

اتنے حالات بھی آزاد کو نہ ملیں (جس نے ان کا زمانہ دیکھا اور ان کی مجلسوں میں شریک ہوا) جس سے اتنا تذکرہ بھی مرتب کیا جا سکے جتنا کم سے کم میر ضاحک اور میر خلیق کا آیا ہے، سمجھ میں نہیں آتا، پھر تمہید کی سطریں بتاتی ہیں کہ انھیں مومن خاں کو ذوق و غالب کی بزم میں لانے اور ان کی صف میں بٹھانے میں تامل ہے، وہ لکھتے ہیں:

"پہلی دفعہ اس نسخہ میں مومن خاں صاحب کا حال نہ لکھا گیا، وجہ یہ تھی کہ دور پنجم ..... جس سے ان کا تعلق ہے، بلکہ دور سوم و چہارم کو بھی اہل نظر دیکھیں کہ جو اہل کمال اس میں بیٹھے ہیں، کس لباس و سامان کے ساتھ ہیں، کسی مجلس میں بیٹھا ہوا انسان جبھی زیب دیتا ہے کہ اسی سامان و شان اور وضع و لباس کے ساتھ ہو جو اہل محفل کے لیے حاصل ہے، نہ ہو تو ناموزوں معلوم ہوتا ہے[1]۔"

لیکن پھر زمانہ نے دوبارہ اپنا حاکمانہ فرمان صادر کیا اور ذوق اور معلوم نہیں کتنے شعراء کے بجائے جن کا آزاد نے آب و تاب کے ساتھ ذکر کیا ہے، مومن خاں کو اہل ذوق اور اہل تحقیق کی توجہات کا مرکز بنا دیا، اور ان کے کلام کو ایک نئی زندگی اور تابانی عطا کی۔

غالب کے تذکرہ میں انھوں نے بے ضرورت ایسے لطیفے لکھے جن سے ان کے اثنا عشری ....

رجحان کا اظہار اور صحابۂ کرام پر طنز ہوتا ہے[2]، اس کے مقابلہ میں استاد ذوق کا مذہب بیان کرنے میں بڑی احتیاط سے کام لیا ہے، لکھتے ہیں:

"علماء اور اساتذۂ سلف کو ہمیشہ باادب یاد کرتے تھے اور کبھی ان پر طعن تشنیع نہ کرتے تھے، اس واسطے ان کے مذہب کا حال کسی پر نہ کھلا[3]۔"

اپنے استاد و مربی سے عقیدت حسن فطرت اور شرافت کا جوہر ہے، آزاد نے اپنے استاد کے حالات کو جس شیفتگی، دل شیفتگی اور ان کے کمالات شاعری کو جس جوش و خروش کے ساتھ بیان کیا ہے

[1] آب حیات ص ۴۲۰ [2] ملاحظہ ہو آب حیات ص ۵۲۸ - ۵۲۹ - ۵۳۰ [3] آب حیات ص ۴۶۷۔

اس پر وہ قابل ملامت یا مستحق شکایت نہیں، بلکہ تعریف و اعتراف کے مستحق ہیں، لیکن جب یہ چیز حدود سے آگے بڑھ جاتی ہے، اور ایک کی حق شناسی کے ساتھ دوسرے کی حق تلفی شامل ہو جاتی ہے تو ضرور قابل شکایت ہے، آزاد نے بہادر شاہ ظفر کے کلام کے متعلق جو رائے دی ہے، اور اس کو جس طرح استاد ہی کے پلہ میں ڈال دیا ہے اس سے خود استاد کی روح خوش نہ ہوگی اور کلام کا فرق سمجھنے والا اس میں شاعر کی زندگی اور واردات کا عکس دیکھنے والا مطمئن نہیں ہوگا، آزاد لکھتے ہیں:

"بادشاہ کے چار دیوان ہیں، پہلے کچھ غزلیں شاہ نصیر کی اصلاحی ہیں، کچھ میر کاظم حسین بے قرار کی ہیں، غرض پہلا دیوان نصف سے زیادہ اور باقی تین دیوان سرتاپا حضرت مرحوم کے ہیں، جن سنگلاخ زمینوں پر قلم چلنا مشکل ہے، ان کا نظام و سرانجام اس خوبصورتی سے کیا ہے کہ دل شگفتہ ہوتے ہیں، والد مرحوم کہا کرتے تھے کہ بادشاہ تمھارا زمین کا بادشاہ ہے، طرحیں خوب نکالتا ہے، مگر تم سرسبز کرتے ہو ورنہ شور زار ہو جائے، مسودۂ خاص میں کوئی شعر پورا، کوئی ڈیڑھ مصرع، کوئی ایک، کوئی آدھا مصرع، فقط بحر اور ردیف و قافیہ باقی بجیر، یہ ان ہڈیوں پر گوشت پوست چڑھا کر حسن و عشق کی پتلیاں بنا دیتے تھے[1]۔"

مصنف گل رعنا اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ہندوستان کی سلطنت دادا کے وقت میں جا چکی تھی، ایک وظیفہ خوار کی حیثیت سے برائے نام بادشاہ رہ گئے تھے، اور ان کی حکومت دہلی میں قلعۂ معلٰی کی چار دیواری کے اندر سمٹ کر رہ گئی تھی لیکن اقلیم سخن کی فرماں روائی دادا سے ترکہ میں ملی تھی، اور اردوئے معلٰی ان کے زیر نگیں تھا، افسوس ہے کہ وہ بھی مولوی محمد حسین آزاد نے ظفر سے چھین کر استاد ذوق کو بخش دی۔

اگر آں ترک شیرازی بدست آرد دل مارا
بخال ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را[2]"

[1] آب حیات ص ۴۹۱ [2] گل رعنا ص ۲۹۷۔

پھر آگے اس کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"لطف یہ ہے کہ چاروں دیوان اس بدنصیب بادشاہ کے چھپ چکے ہیں، اور حضرت ذوقؔ کا بھی تھوڑا بہت جو کچھ کلام مل سکا ہے، وہ ایک دیوان کی شکل میں شایع ہو چکا ہے۔ ان دونوں کو پڑھو، اور ہر ایک کے انداز سخن پر غور کرو۔ پھر اپنی فطرت سلیم سے فتویٰ لو، دونوں کی حیثیتیں جداگانہ نظر آئیں گی، ذوقؔ پھر بھی ذوقؔ ہیں، ظفرؔ کے استاد، ان کے کلام کی رنگینی، ترکیب کی چستی، مضمون کی بندش، جوش و خروش، ان کی باتیں ان کے ساتھ ہیں، ظفرؔ کے ہاں جو سامان نظر آئے گا، وہ اس سے ملتا جلتا ہوگا، اور یہ ہونا بھی چاہیے، کیونکہ استاد کا رنگ شاگرد میں آنا ضرور ہے، مگر پھر بھی وہ دوسری طرح کا ہوگا، محاوروں کی فراوانی یہاں زیادہ ملے گی، مگر جوش و خروش کی جگہ دل و جگر کے ٹکڑے حروف و الفاظ بن کر آنسوؤں کی سیاہی اور آہ جگر دوز کے قلم سے لکھے ہوئے تم کو ملیں گے، اب انھیں ظفرؔ کا سمجھو یا ذوقؔ کا۔"[1]

اسی طرح ان کو اس سے بھی اختلاف ہے کہ نواب الٰہی بخش خان معروفؔ کا کلام استاد ذوقؔ ہی کی شاعری کا کارنامہ ہے، وہ لکھتے ہیں:

"آزادؔ نے آب حیات میں جس طرح ظفرؔ مرحوم کی کاوش فکر پر پانی پھیرا ہے، ان کے بھی نتائجِ فکر کو اپنے استاد ذوقؔ کے دامن کمال سے وابستہ کر دیا ہے، باوجودیکہ اس کہنہ مشق شاعر کی عمر اس وقت چھیاسٹھ[66] برس کی تھی، اور ذوقؔ بمشکل اٹھارہ[18] برس کے بچے ہوں گے، مگر جوش عقیدت میں اس کا خیال نہیں رہا۔"[2]

ان فروگذاشتوں اور ناہمواریوں کے باوجود آب حیات کی "انفرادیت" قائم تھی، اور رہے گی، اور اس کی ادبی قدر و قیمت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی، ضرورت اس کی تھی کہ اس کے اس تاریخی حصہ کو

۱؎ گل رعنا ص ۲۹۰، طبع چہارم ۲؎ حاشیہ گل رعنا ص ۳۰۰، طبع چہارم۔

مکمل کر دیا جائے، اور اس کی ان غلطیوں کی نشاندہی کر دی جائے جو مصنف کی ادبی افتاد طبع یا اس وجہ سے پیدا ہوئیں کہ مصنف کی ہندوستان کے اسلامی عہد کی تاریخ پر وسیع اور گہری نظر نہ تھی، اور وہ اس کے بعض شعبوں (مثلاً تصوف و سلوک، علماء و مشایخ کے حالات، ملفوظات و مخطوطات) کا رمز شناس اور خصوصی طالب علم نہیں رہا تھا۔

مولانا سید عبدالحئی صاحب نے اپنی عربی تصنیفات نزہۃ الخواطر[1]، معارف العوارف[2] اور جنۃ المشرق[3] کی تالیف و ترتیب کے سلسلہ میں ہندوستان کی سیاسی، تمدنی، علمی اور ادبی تاریخ کا وسیع مطالعہ کیا تھا، اور اس ضرورت سے انھوں نے سیکڑوں متعلق اور غیر متعلق کتابیں اور ہزارہا صفحات پڑھے تھے، ان میں بلا ارادہ بہت سا مواد ان کی نظر سے گذرا جس سے اردو زبان کے آغاز، اس کی شعر و شاعری کی تاریخ اور اردو شعراء کے حالات زندگی اور ان کے کمالات پر روشنی پڑتی تھی، اور ان سے اردو زبان و شاعری کی تاریخ اور شعراء کا تذکرہ مرتب کرنے میں بیش قیمت مدد ملتی تھی، بہت سے نظریات جو اس وقت تک مشہور و مقبول تھے ان کی تردید ہوتی تھی، اور بہت سے

۱؎ نزہۃ الخواطر پہلی صدی ہجری سے لے کر مصنف کے عہد تک کی ممتاز ہندوستانی شخصیتوں کے تذکرہ پر مشتمل ہے اس کی آٹھ جلدیں ہیں، دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد کی طرف سے اس کے دو ایڈیشن نکل چکے ہیں ۲؎ معارف العوارف یہ ہندوستان کے اسلامی عہد کی علمی تصنیفی، تعلیمی تاریخ اور ہندوستانی مصنفین و تصنیفات کی ڈائرکٹری ہے، دمشق کی مشہور رائل اکیڈمی المجمع العلمی العربی کی طرف سے الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند کے نام سے شایع ہو چکی ہے، دار المصنفین کی طرف سے اس کا اردو ترجمہ "اسلامی علوم و فنون ہندوستان میں" کے نام سے شایع ہوا ہے۔ ۳؎ یہ کتاب ہندوستان کے اسلامی عہد کا مرقع ہے، دائرۃ المعارف حیدرآباد کی طرف سے الہند فی العہد الاسلامی کے نام سے، اردو میں "ہندوستان اسلامی عہد میں" اور انگریزی میں India During Muslim Rule کے نام سے شایع ہو چکی ہے۔

نے حقایق سامنے آتے تھے، آبِ حیات میں جس کا مطالعہ انھوں نے اس کی اشاعت کے بعد ہی کر لیا ہوگا، بہت سی چیزیں ان کے تاریخی ذوق کو کھٹکیں اور ان کی مورخانہ نظر میں کھٹکی ہوں گی، اس لیے اس کا داعیہ پیدا ہونا ایک قدرتی امر تھا کہ وہ اس موضوع پر قلم اٹھائیں اور ان اغلاط کی تصحیح کریں جو نادانستہ آبِ حیات میں آگئی ہیں، اور یہ حق کسی صاحبِ قلم اور صاحبِ نظر سے چھینا نہیں جا سکتا،

شاید ان کو اس کام کی تکمیل میں دیر لگتی، یا عربی تصنیفات کی تکمیل کا کام اور زندگی کے دوسرے مشاغل اس کی مہلت نہ دیتے کہ ۱۳۳۹ھ (مطابق ۱۹۲۱ء) میں وجع مفاصل کا ان پر حملہ ہوا، اور نقل و حرکت ان کو دشوار ہو گئی، مریضوں کو دیکھنا، مطب میں جانا، ندوۃ العلماء کے جلسوں میں شرکت سب ناممکن ہو گئی، تصنیفی و تحریری کام ان کی طبیعت ثانیہ بن گیا تھا اور وہ یکسر بیکار و معطل نہیں رہ سکتے تھے، اس حالت میں وقت گذاری اور تفریح کے لیے ان کو اپنی پرانی بیاضیں یاد آئیں، اس کو نکالا تو معلوم ہوا کہ مشہور مشہور شاعروں کا کلام اس میں اتنا جمع ہو چکا ہے کہ اگر اس کو ترتیب دے کر شایع کر دیا جائے تو پڑھنے والوں کو اس سے دلچسپی ہو سکتی ہے، اس کے ساتھ خیال ہوا کہ جن کا کلام ہو ان کے مختصر مختصر حالات بھی لکھ دیے جائیں، تذکرے جمع کیے اور کام شروع کیا، بات میں بات نکلتی آئی اور وہ ایک خاصی کتاب بن گئی۔[1]

یہ گل رعنا کی تصنیف کی مختصر کہانی ہے، جو مصنف نے اس کتاب کی شانِ ورود کے سلسلہ میں خود سنائی ہے، اس کتاب کا مسودہ انھوں نے مولانا سید سلیمان ندویؒ ناظم دار المصنفین کے پاس بھیج دیا، جن سے ان کو عزیزانہ تعلق تھا، اس عرصہ میں ان کی وفات ہو گئی اور وہ کتاب کو مطبوعہ شکل میں نہ دیکھ سکے، غالباً جمادی الاولیٰ ۱۳۴۳ھ میں یہ کتاب دار المصنفین سے چھپ کر شایع ہوئی، اس لیے کہ جمادی الثانی ۱۳۴۳ھ، جنوری ۱۹۲۵ء کے "معارف" کے شذرات میں جو مولانا عبد السلام صاحب ندوی مرحوم کے

۱؎ پیش لفظ مصنف گل رعنا ص ۳ طبع چہارم

قلم سے ہیں، پہلی مرتبہ اس کتاب کا تعارف اور اس کی طباعت کا اعلان نظر آیا، اس وقت ان کے بہت سے دوستوں اور شناساؤں کے لیے یہ انکشاف تھا کہ ان کو اس موضوع سے اس درجہ کا ذوق اور واقفیت ہے کہ اس موضوع پر ان کے قلم سے ایک ایسی وقیع تصنیف نکل سکتی ہے، رسالہ اردو (انجمن ترقی اردو اورنگ آباد) کے ذی الحجہ ۱۳۴۳ھ، جولائی ۱۹۲۵ء کے شمارہ میں اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر مولوی عبد الحق صاحب نے یہ صحیح لکھا:

"جو لوگ مولانا مرحوم سے ذاتی واقفیت رکھتے تھے، انھیں ممکن ہے کہ اس کا علم ہو، ورنہ عام طور پر لوگ اس سے لاعلم تھے کہ مولانا مرحوم اردو زبان و ادب کا ایسا اچھا ذوق رکھتے ہیں اور ایسا خیال کچھ بیجا بھی نہ تھا، کیونکہ مولوی صاحبان نے عموماً اردو زبان کی طرف سے غفلت برتی ہے۔[1]

معلوم ہوتا ہے کہ یہ ادبی ذوق مولانا کو اپنے والد ماجد سے ارثاً ملا ہے، جو اردو و فارسی کے اچھے شاعر تھے، اور جن کا حال اور کلام کا نمونہ انھوں نے کتاب کے آخر میں دیا ہے۔[2]"

کسی تصنیفی کاوش کو اس زمانہ کے حدود، ماحول اور مصنف کے مقرر کیے ہوئے پیمانہ اور اس کے تصنیفی منصوبہ سے علحدہ کر کے کسی دوسرے زمانہ کے حدود و ماحول میں رکھ کر اس زمانہ کے معیاروں، اصطلاحوں اور مقرر کردہ اصولوں سے جانچنا اور ناپنا صحیح نہیں ہوتا، مصنف ادب و شاعری کے ان تنقیدی اصولوں سے واقفیت نہیں رکھتے تھے، جو بیسویں صدی کے وسط میں مغربی ممالک میں دریافت کیے گئے، اور صدیوں کی کاوشوں کے بعد انھوں نے ارتقاء کے منازل طے کیے، ان میں بھی ایک بڑا حصہ وہ ہے، جو مغربی ماحول و معاشرہ کی آب و ہوا، مخصوص سیاسی و تمدنی عوامل کا نتیجہ اور

۱؎ پچھلے دور کے فضلائے مدارس کے متعلق تو یہ کہنا کسی حد تک صحیح ہوگا، لیکن ۱۹۵۰ء اور اس کے بعد تک کے علماء پر یہ الزام صحیح نہیں، جیسا کہ ہم نے اس مضمون کے آغاز میں ذکر کیا ہے۔ ۲؎ رسالہ اردو بابت جولائی ۱۹۲۵ء، ص ۵۰۶۔

مغربی زبانوں اور ان کے ادب و شاعری کے مخصوص مزاج سے تعلق رکھتا ہے، اور مشرقی زبانوں اور ان کے ادب و شاعری پر جوں کا توں ان کا انطباق نہیں کیا جا سکتا، مصنف گلِ رعنا نے کہیں بھی اس کا دعویٰ نہیں کیا کہ یہ کتاب تنقید کا اعلیٰ نمونہ ہے، اور اس میں وہ تنقید کے اعلیٰ معیاروں کی پیروی کریں گے جو اس وقت تک دریافت ہو چکے ہیں، انھوں نے پوری حقیقت پسندی اور سادگی کے ساتھ اس کتاب کی ترتیب کے محرکات و دواعی اور اس تصنیف کے اغراض و مقاصد اور اس کے پیمانہ اور رقبہ کا اپنے پیش لفظ میں اظہار کر دیا ہے، انھوں نے اردو زبان و ادب اور شاعری کی تاریخ کے طالب علموں کو اس کتاب کے ذریعہ بہت سی نئی معلومات دی ہیں، متعدد نئے ماخذوں کی طرف توجہ دلائی ہے اردو زبان اور شاعری کے آغاز کو وہ "آبِ حیات" اور دوسرے قدیم تذکروں سے کئی قدم پیچھے لے گئے ہیں جب دکن و گجرات میں صوفیائے کرام کے ذریعہ اس عام فہم بولی کا اور سلاطینِ دکن اور ان کے عہد کے شعراء کے ذریعہ اس مرغوبِ طبع شاعری کا آغاز ہو گیا تھا، انھوں نے بہت سی تاریخی غلطیوں کی تصحیح کی اور بقول ڈاکٹر مولوی عبد الحق صاحب:

"ہر شاعر کے کلام سے نمونہ بھی دیا گیا ہے، جس سے فاضل مؤلف کی وسعتِ نظر کا ثبوت ملتا ہے، اگرچہ زبان و شعراء کے کلام پر اعلیٰ تنقید کا حق ادا نہیں کیا گیا، تاہم ہر شاعر کے کلام پر بہت ہی منصفانہ رائے کا اظہار کیا گیا ہے"[1]

کتاب میں مفید حواشی کا اضافہ کیا گیا ہے جو بہت معلومات افزا، دلچسپ، اور ان کی اردو انشاپردازی اور سیرت نگاری کا عمدہ نمونہ ہیں، چونکہ ہندوستان کے اسلامی عہد کی تاریخ اور تراجم رجال ان کا خاص موضوع رہا ہے، اور نزہۃ الخواطر جیسی کتاب ان کے قلم سے نکل چکی ہے، اس لیے ان حواشی میں تاریخ کے طالب علموں کو بہت سی نئی معلومات اور ضخیم کتابوں کا عطر مل جاتا ہے، اودھ چونکہ ان کا وطن ہے اور

---

[1] رسالہ اردو جولائی ۱۹۲۵ء

اس کی تاریخ کا انھوں نے بنظرِ غائر مطالعہ کیا ہے، اس لیے اس صوبہ سے تعلق رکھنے والی شخصیتوں پر انھوں نے جو حواشی لکھے ہیں، وہ بہت پُر از معلومات اور مبصرانہ ہیں، اور ان میں ان شخصیتوں کی صحیح تصویر کشی اور سلطنتِ اودھ کے عہد کی بولتی ہوئی تصویر آ گئی ہے، علم کی سچی پیاس اور اپنی زبان سے بے لوث محبت کا ہمیشہ سے یہ خاصہ رہا ہے کہ اگر ہزاروں صفحات کی ورق گردانی سے کام کی کوئی ایک چیز ہاتھ آ جائے تو اس کو آنکھوں سے لگایا جاتا ہے، اور دل میں جگہ دی جاتی ہے، اور اگر کوئی اجنبی اور بیگانہ بھی راستہ گذرتے کوئی ایسی صدا لگا دیتا ہے جس سے منزلِ مقصود کی دریافت، یا گوہرِ مقصود کے حصول میں ادنیٰ سی مدد ملتی ہے تو اس کو ہزار بار شکریہ کے ساتھ قبول کیا جاتا ہے، علم و ادب کی ترقی ہر زبان و ادب اور ہر ملک و ملت میں ان سب لوگوں کی رہینِ منت ہے جنھوں نے اس کے خرمن میں ایک دانہ کا بھی اضافہ کیا، یا اس کے گیسو سنوارنے یا گرد و غبار اور خس و خاشاک دور کرنے میں ہاتھ کا بھی اشارہ کیا، خود مغربی ممالک کے ادب و زبان اور فنِ تنقید کی تاریخ تشکر و ممنونیت اور اقرار و اعتراف کے ان شریفانہ نمونوں سے لبریز ہے جس کی تقلید و پیروی ہمارے مشرقی ممالک کے لیے معراجِ کمال اور ہمارے ادیبوں اور ناقدوں کے لیے سدرۃ المنتہیٰ ہی ہوتی ہے۔

اردو میں آبِ حیات کے بعد کوئی ایسا مسلسل و مکمل، شستہ و شائستہ تذکرہ موجود نہیں تھا جو سلجھے ہوئے انداز اور سادہ اور شیریں زبان میں اردو شعراء کے متعلق ایک متوسط درجہ کے طالبِ علم اور شائقِ فن کو بنیادی اور ضروری معلومات مہیا کرتا، اس لیے جیسے ہی گلِ رعنا ملک کے موقر علمی ادارہ دار المصنفین سے شائع ہوئی وہ ہاتھوں ہاتھ لی گئی، ہندوستان کی متعدد یونیورسٹیوں کے اعلیٰ اردو نصاب میں داخل کی گئی، اس کے متعدد ایڈیشن نکل چکے ہیں، اور ہندوستان و پاکستان میں یکساں طریقہ پر ایک اہم نصابی کتاب اور وقیع علمی ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے، اور مسرت کی بات ہے کہ اب خود دار المصنفین کی طرف سے اس کا پانچواں ایڈیشن شائع ہو رہا ہے۔

مغربی زبانوں اور ان کے ادب و شاعری کے مخصوص مزاج سے تعلق رکھتا ہے، اور مشرقی زبانوں اور ان کے ادب و شاعری پر جوں کا توں ان کا انطباق نہیں کیا جا سکتا۔ مصنف گل رعنا نے کہیں بھی اس کا دعویٰ نہیں کیا کہ یہ کتاب تنقید کا اعلیٰ نمونہ ہے، اور اس میں وہ تنقید کے اعلیٰ معیاروں کی پیروی کریں گے جو اس وقت تک دریافت ہو چکے ہیں۔ انھوں نے پوری حقیقت پسندی اور سادگی کے ساتھ اس کتاب کی ترتیب کے محرکات و دواعی اور اس تصنیف کے اغراض و مقاصد اور اس کے پیمانہ اور رقبہ کا اپنے پیش لفظ میں اظہار کر دیا ہے۔ انھوں نے اردو زبان و ادب اور شاعری کی تاریخ کے طالب علموں کو اس کتاب کے ذریعہ بہت سی نئی معلومات دی ہیں، متعدد نئے ماخذوں کی طرف توجہ دلائی ہے، اردو زبان اور شاعری کے آغاز کو وہ "آب حیات" اور دوسرے قدیم تذکروں سے کئی قدم پیچھے لے گئے ہیں جب دکن و گجرات میں صوفیائے کرام کے ذریعہ اس عام فہم بولی کا اور سلاطین دکن اور ان کے عہد کے شعراء کے ذریعہ اس مرغوب طبع شاعری کا آغاز ہو گیا تھا۔ انھوں نے بہت سی تاریخی غلطیوں کی تصحیح کی اور بقول ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب:

"ہر شاعر کے کلام سے نمونہ بھی دیا گیا ہے، جس سے فاضل مؤلف کی وسعت نظر کا ثبوت ملتا ہے، اگرچہ زبان و شعراء کے کلام پر اعلیٰ تنقید کا حق ادا نہیں کیا گیا، تاہم ہر شاعر کے کلام پر بہت ہی منصفانہ رائے کا اظہار کیا گیا ہے۔"[1]

کتاب میں مفید حواشی کا اضافہ کیا گیا ہے جو بہت معلومات افزا، دلچسپ، اور ان کی اردو انشا پردازی اور سیرت نگاری کا عمدہ نمونہ ہیں، چونکہ ہندوستان کے اسلامی عہد کی تاریخ اور تراجم رجال ان کا خاص موضوع رہا ہے، اور نزہۃ الخواطر جیسی کتاب ان کے قلم سے نکل چکی ہے، اس لیے ان حواشی میں تاریخ کے طالب علموں کو بہت سی نئی معلومات اور ضخیم کتابوں کا عطر مل جاتا ہے، اودھ چونکہ ان کا وطن ہے اور

---

[1] رسالہ اردو جولائی ۱۹۳۶ء

اس کی تاریخ کا انھوں نے بنظر غائر مطالعہ کیا ہے، اس لیے اس صوبہ سے تعلق رکھنے والی شخصیتوں پر انھوں نے جو حواشی لکھے ہیں، وہ بہت پر از معلومات اور مبصرانہ ہیں، اور ان میں ان شخصیتوں کی صحیح تصویر کشی اور سلطنت اودھ کے عہد کی بولتی ہوئی تصویر آگئی ہے، علم کی سچی پیاس اور اپنی زبان سے بے لوث محبت کا ہمیشہ سے یہ خاصہ رہا ہے کہ اگر ہزاروں صفحات کی ورق گردانی سے کام کی کوئی ایک چیز ہاتھ آجائے تو اس کو آنکھوں سے لگایا جاتا ہے اور دل میں جگہ دی جاتی ہے، اور اگر کوئی اجنبی اور بیگانہ بھی راستہ گذرتے کوئی ایسی صدا لگا دیتا ہے جس سے منزل مقصود کی دریافت، یا گوہر مقصود کے حصول میں ادنیٰ سی مدد ملتی ہے تو اس کو ہزار بار شکریہ کے ساتھ قبول کیا جاتا ہے، علم و ادب کی ترقی ہر زبان و ادب اور ہر ملک و ملت میں ان سب لوگوں کی رہین منت ہے جنھوں نے اس کے خرمن میں ایک دانہ کا بھی اضافہ کیا، یا اس کے گیسو سنوارنے یا گرد و غبار اور خس و خاشاک دور کرنے میں ہاتھ کا بھی اشارہ کیا، خود مغربی ممالک کے ادب و زبان اور فن تنقید کی تاریخ تشکر و ممنونیت اور اقرار و اعتراف کے ان شریفانہ نمونوں سے لبریز ہے جس کی تقلید و پیروی ہمارے مشرقی ممالک کے لیے معراج کمال اور ہمارے ادیبوں اور ناقدوں کے لیے سدرۃ المنتہیٰ ہی ہوتی ہے۔

اردو میں آب حیات کے بعد کوئی ایسا مسلسل و مکمل شستہ و شائستہ تذکرہ موجود نہیں تھا جو سلجھے ہوئے انداز اور سادہ اور شیریں زبان میں اردو شعراء کے متعلق ایک متوسط درجہ کے طالب علم اور شائق فن کو بنیادی اور ضروری معلومات مہیا کرتا، اس لیے جیسے ہی گل رعنا ملک کے موقر علمی ادارہ دارالمصنفین سے شائع ہوئی وہ ہاتھوں ہاتھ لی گئی، ہندوستان کی متعدد یونیورسٹیوں کے اعلیٰ اردو نصاب میں داخل کی گئی، اس کے متعدد ایڈیشن نکل چکے ہیں، اور ہندوستان و پاکستان میں یکساں طریقہ پر ایک اہم نصابی کتاب اور وقیع علمی ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے، اور مسرت کی بات ہے کہ اب خود دارالمصنفین کی طرف سے اس کا پانچواں ایڈیشن شائع ہو رہا ہے۔

سرہملٹن الیگزنڈر روسکین گب

(۱۸۹۵ء — ۱۹۷۱ء)

از

پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی، جامعہ ملیہ دہلی

مشرق کے مذاہب اور تہذیب و تمدن کے مطالعہ کے لیے مستشرقین نے جو کوششیں کی ہیں ان کے مقام و مرتبہ کا ہمیں احساس ہے، اس میدان میں ان کی کاوشوں نے استشراق کو علم کا ایک ممتاز و وقیع شعبہ یعنی ایک مخصوص ڈسپلن بنا دیا۔

مستشرقین نے مشرق کے علمی خزینے کے ایک بڑے حصہ کو جو وقت کے دبیز دھندلکوں میں دفن تھا، نکالا، نادر اور نایاب کتابوں کا پتہ چلا کر اور انھیں حاصل کرکے ان کا مطالعہ کیا اور ان میں سے بہت سے نوادرات کو ایڈٹ کرکے بہنایت اہتمام کے ساتھ شایع کیا، ان پر حواشی لکھے، بعض کی شرحیں کیں، مختلف زبانوں میں ان کے تراجم شایع کیے اور پھر ان سے مشرق اور مغرب کے عالموں اور محققین نے استفادہ کیا، انھوں نے تحقیق و تنقید کے ارتقاء پذیر اصولوں اور طریقوں کی مدد سے اپنے تحقیقی کام اور علمی مقاصد کو باوقار بنانے کی بھی کوشش کی، اس کے علاوہ تہذیبوں اور مذہبوں کے مطالعہ میں انھوں نے دوسرے علوم مثلاً لسانیات، علم الالسنہ، فلسفہ، تاریخ اور سماجی علوم سے بھی مدد لی، اور اس طرح علم الاستشراق کو ایک Inter disciplinary بنا دیا۔

ہمیں ایسے مستشرقین کی علمی خدمات کا اعتراف ہے، لیکن ہمیں اس کا افسوس ہے کہ ان کے علمی کارناموں کی جو کئی لحاظ سے قابلِ قدر ہیں سب سے بڑی کمزوری ان کی موضوعیت اور داخلیت ہے، انھوں نے دعویٰ تو کیا معروضی مطالعہ کا، لیکن حقیقت میں ان میں شاید ایک بھی ایسا نہیں جو اپنے ذہنی تحفظات اور مذہبی و تہذیبی تعصبات سے اپنا دامن محفوظ رکھ سکا ہو، خاص طور پر اسلام، قانون اسلام، قرآن اور پیغمبر اسلام سے متعلق ان کے مطالعات غیر معروضی ہی نہیں بلکہ اکثر مصنفین کے یہاں ان کا تعصب بھی صاف طور پر نمایاں ہے۔

مستشرقین میں عیسائی بھی ہیں اور یہودی بھی، لیکن عیسائیوں کی تعداد بہت زیادہ ہے، اور اس کے تاریخی و سیاسی اسباب ہیں، یہ لوگ اسلام اور پیغمبر اسلام سے نفرت اور تعصب کی جن روایات کے وارث ہیں، ان کی داستان صدیوں پرانی ہے، بلکہ اگر یہ کہا جائے تو بجا ہوگا کہ یہ داستان چودہ سو (۱۴۰۰) برس پر پھیلی ہوئی ہے، اس میں کئی اتار چڑھاؤ ہیں، اس کے کردار بدلتے رہے ہیں، اس کے پلاٹ میں تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں، لیکن داستان کا بنیادی نکتہ ایک اور صرف ایک رہا ہے۔

بیسویں صدی کے تیسرے دہے سے، اور خاص طور پر دوسری جنگ عظیم کے بعد مستشرقین کے رویے میں خاصی تبدیلی ہوئی ہے، اس تبدیلی کے سیاسی و معاشی اسباب ہیں، لیکن اس زمانہ میں علم الاستشراق یعنی اورینٹلزم کا علمی اعتبار سے انحطاط بھی ہوا ہے، اور اب ایسے عالم مستشرق نہیں ملتے جیسے کہ انیسویں صدی اور بیسویں صدی کے اوائل میں تھے، بس ایک سنجیدہ اور بردبار مستشرق نظر آتا ہے، جس کا علم بھی گہرا ہے اور نظر بھی دقیق ہے، لیکن وہ بھی مکمل طور پر غیر جانبدار نہیں ہے اور ان کی بعض تحریروں میں ان نظریات و تصورات کی جھلک دکھائی دیتی ہے جو اسے اس شعبۂ علم میں اپنے پیشروؤں سے ورثہ میں ملے ہیں، ہماری مراد سر ہملٹن الیگزنڈر روسکین گب سے ہے، جو علمی دنیا میں ایچ۔ اے۔ آر۔ گب کے نام سے مشہور ہیں اور وہی اس مقالہ کا موضوع ہیں۔

سر ہیملٹن گب ۲ر جنوری ۱۸۹۵ء کو اسکندریہ میں پیدا ہوئے، جہاں ان کے والد ایک کمپنی میں ملازم تھے، ان کی تعلیم اسکاٹ لینڈ میں ایڈنبرا کے رائل ہائی اسکول اور ایڈنبرا یونیورسٹی میں ہوئی، ایڈنبرا یونیورسٹی میں وہ ۱۹۱۲ء میں داخل ہوئے، جہاں ان کے خاص مضامین سامی زبانیں یعنی عبرانی، عربی اور آرامی تھیں، پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی تو انھوں نے رائل فیلڈ آرٹلری میں شامل ہو کر فرانس اور اٹلی میں فوجی خدمات انجام دیں، ۱۹۱۹ء میں انھیں ان کی درخواست پر یونیورسٹی سے زمانۂ جنگ کی ڈگری ملی، اور پھر وہ لندن کے اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز میں داخل ہوئے جہاں سے انھوں نے ۱۹۲۲ء میں عربی میں ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کی، ۱۹۲۱ء ہی میں وہ سر تھامس آرنلڈ کی زیر نگرانی عربی کے لکچرر مقرر ہو گئے تھے، ۱۹۲۶ء میں انھوں نے مشرق وسطیٰ کا سفر کیا، جہاں وہ تقریباً ایک سال مقیم رہ کر جدید عربی ادب کا مطالعہ کرتے رہے، اس سے قبل وہ کئی مہینے شمالی افریقہ میں گذار چکے تھے، ۱۹۲۹ء میں وہ لندن یونیورسٹی میں تاریخ ادب عربی کے ریڈر مقرر ہوئے اور ۱۹۳۰ء میں آرنلڈ کے انتقال کے بعد وہ ان کے جانشین کی حیثیت سے اس شعبہ کے سربراہ بن گئے، آرنلڈ کے بعد وہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے انگریزی ایڈیٹر بھی مقرر ہوئے، اس حیثیت سے ۱۹۵۶ء تک وہ اس انسائیکلوپیڈیا کی تالیف میں شریک رہے، اس کے دونوں ایڈیشنوں میں ان کے بہت سے مضامین شامل ہیں، لندن یونیورسٹی کے شعبۂ عربی میں وہ ۱۹۳۷ء تک رہے، اسی سال وہ عربی کے پروفیسر ہو کر آکسفورڈ چلے گئے جہاں ان کا قیام ۱۹۵۵ء تک رہا، ۱۹۵۵ء میں امریکہ کی مشہور یونیورسٹی ہارورڈ نے انھیں عربی کے پروفیسر کی حیثیت سے بلایا، اس خیال سے کہ امریکہ میں مشرق وسطیٰ سے متعلق علاقائی مطالعات کے وسیع امکانات ہیں، انھوں نے ہارورڈ یونیورسٹی کی پیش کش کو قبول کر لیا، ۱۹۵۷ء میں وہ ہارورڈ یونیورسٹی میں مڈل ایسٹرن اسٹڈیز سینٹر کے ڈائرکٹر مقرر ہوئے، ۱۹۶۴ء میں وہ عربی کی پروفیسری سے

ریٹائر ہو گئے، لیکن سنٹر کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے کام کرتے رہے، اسی سال وہ سخت بیمار پڑے اور ان پر فالج کا حملہ ہوا، اس کے بعد زندگی کے باقی دن انھوں نے آکسفورڈ میں گذارے جہاں ان کی اہلیہ لیڈی گب نے ۱۹۶۹ء تک کہ اسی سال لیڈی گب کا انتقال ہوا، ان کی خدمت گذاری اور تیمارداری کی، لیڈی گب کی وفات کے بعد کوئی دو سال وہ اور زندہ رہے، لیکن یہ دو سال ان پر بڑے سخت گذرے، تنہائی اور بے بسی کی زندگی، مفلوج زندگی، اب وہ زیادہ عرصہ زندہ نہیں رہ سکتے تھے، آخر ۲۲ر اکتوبر ۱۹۷۱ء کو انھوں نے اس دنیا کو خیرباد کہا۔

علمی دنیا نے سر ہیملٹن گب کے علمی کارناموں کا خوب خوب اعتراف کیا، کئی اعزاز ان کو ملے، کئی علمی و ادبی سوسائٹیوں کے وہ ممبر رہے، لیکن ان سب کی تفصیلات کا یہ موقع نہیں، البتہ شاید اس بات کا جاننا لوگوں کے لیے دلچسپی کا باعث ہو کہ گب قاہرہ کی اکیڈمی آف لنگویج اور دمشق اور بغداد کی عربی اکادمیوں کے بھی ممبر تھے، گب نے خود کافی لکھا اور بہت سی کتابوں کے ریویوز بھی لکھے، ان کے مضامین کی فہرست بھی خاصی طویل ہے، یہاں ان کی خاص تصانیف کی فہرست، تاریخ طباعت کی ترتیب سے درج کی جاتی ہے:

(۱) The Arab Corqueatin Central Asia (London 1923)

(۲) Arabic Literature (London, 1926) revised edition oxford 1963

(۳) Ibn Battuta, Trawels in Asia and Africa (London 1929)

(۴) Damascus Chronicles of The Crusades (London, 1932)

(۵) Modern Trends in Islam (Chiaago, 1947)

(۶) Mohammadanism (London, 1949)

اب تک اس کتاب کے پانچ ایڈیشن شایع ہو چکے ہیں۔

of Saladin (5) The Achievement of Saladin. (6) Al-Mawardi's Theory of The Caliphate. (7) The Islamic Background of Ibn Khaldun's Political Theory (8) The Structure of Religious Thought in Islam.

ان کے علاوہ جدید عربی ادب کے ارتقا، پر بھی اُن کے بعض مضامین ہیں، جن میں جدید رجحانات کے متعلق سیر حاصل بحث کی گئی ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ پروفیسر گب اپنے اکثر معاصر مستشرقین کے مقابلہ میں عربی زبان و ادب سے کہیں زیادہ واقف تھے، بلکہ ان سے ایک گہرا تعلق بھی رکھتے تھے Islamic Biographical Literature ان کے ایک مضمون (اسلامی سوانحی ادب) سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ اسلام اور تاریخ اسلام کے مطالعات میں عربی ادب کے وسیع مطالعہ کو کتنی اہمیت دیتے تھے، وہ درحقیقت عربی زبان کے شیدائیوں میں تھے، اور عربی ادب کے شہ پاروں کے تخلیقی حسن کے بڑے قدر دان تھے، مقدمۂ تاریخ ابن خلدون کوئی چالیس برس تک ان کے فکر و نظر کی جولان گاہ رہا، اور وہ اس سے علم و آگہی اور مسرت و انبساط حاصل کرتے رہے، اس کے ادبی محاسن کا ذکر انھوں نے کچھ اس طرح کیا ہے:

"ابن خلدون کا تخیل جو ایک حیات آفریں، براہ راست اور رنگین و رعنا شخصیت کا حامل ہے معنوی عظمتوں کو چھوتا ہے، اس کی طلاقت لسانی سے فراوانی اور وفور کا احساس ہوتا ہے، اس کے خیالات آبشار آسا بڑھتے ہیں، مگر کبھی کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ پُرجوش بے ربطی کی نیم ظلمتوں میں

Historians of the Middle East (edd. B. Lewis and P.M. Holt, 1962), London, 1962, pp. 54-58

(۶) Islamic Society and The West, vol I (Part I London 1950; Part II London, 1957 with H. Bowen)

(۸) The Travels of Ibn Battuta (Cambridge, vol. I, 1958. vol II, 1961)

(۹) Studies on the Civilization of Islam (edd. S. J. Shaw and W. R. Polk. Boston, 1962)

(۱۰) The Life of Saladin - from The Works of Imaduddin and Baha-uddin (Oxford, 1973)

مغرب میں سر ہیملٹن گب کے عقیدتمندوں نے انھیں صف اول کے اسلامک اسکالرز میں شمار کیا ہے، ظاہر ہے کہ اس سے ان کی مراد مغرب کے ان علمائے محققین سے ہے جنھوں نے اسلام کے مطالعہ میں اپنی زندگی کا بیشتر حصہ صرف کیا، وہ مسلمان بھی ان کی محققانہ قابلیت اور مورخانہ ژرف بینی کے قائل ہیں جنھوں نے ان کی تصنیفات کا بنظر غائر مطالعہ کیا ہے، اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ پروفیسر گب کی بعض کتابیں اور مضامین ان کے وسیع مطالعہ، تعبیر و تشریح کی بھرپور صلاحیت، فکر کی شادابی و تازگی اور گہری تاریخی بصیرت کے شاہد ہیں، ذیل میں ہم ان کے چند مضامین کے عنوانات درج کرتے ہیں، یہ مضامین تھوڑے تھوڑے وقفے سے دنیا کے مشہور علمی مجلات میں شائع ہوئے اور ان کے مضامین کے گراں قدر مجموعے Studies on The Civilization of Islam میں شامل ہیں:

(1) An Interpretation of Islamic History (2) Social Significance of The Shu'ubiya (3) The Evolution of Government in Early Islam. (4) The Armies

کھو جاتے ہیں، لیکن ابن خلدون کی خوش وضع اور خوش آہنگ نثر بڑی حد تک انھیں مربوط رکھتی ہے، جملوں میں تراکیب اور فقروں کی چست اور نفیس تنظیم انھیں قابو میں رکھتی ہے، وہ اپنے خیالات کا اظہار ایک ایسی تربیت یافتہ شائستگی اور لطافت سے کرتا ہے کہ ہر لفظ معنوی طور پر اس کے دلائل کا تابع ہوتا ہے۔"

دراصل ہیملٹن گب کا خاص میدان تاریخ و تمدن تھا اور ان دونوں کے ارتقاء و نشوونما میں وہ زبان و ادب کے رول کی اہمیت سے بخوبی واقف تھے لیکن تاریخ و تمدن کے موضوعات پر انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اس میں ہمیں ان کی تمام تعبیرات و تشریحات سے اتفاق نہیں ہے، اور بعض مقامات پر صاف معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے پہلے ہی سے کچھ نظریے قائم کر لیے ہیں، اور واقعات کو وہ اپنے انہی نظریوں کی روشنی میں دیکھتے ہیں، مثلاً اپنے مضمون An Interpretation of Islamic History میں وہ پورے یقین کے ساتھ لکھتے ہیں کہ چونکہ ناگزیر معاشی محرکات نے عرب کے حالات میں استحکام کی کسی صورت کو تقریباً ناممکن بنا دیا تھا اس لیے بادیہ نشین قبائل کی مخالفت کو فوجی طاقت کے ذریعہ دبا دینا مسئلہ کا مناسب اور مستقل حل نہیں ہو سکتا تھا اس کے لیے ضروری تھا کہ ایسے حالات پیدا کیے جائیں جن میں عرب کے قبائل اگر اسلام میں پورے طور پر داخل نہ ہوں تو کم از کم اسلام سے اپنے دنیوی مفاد کو وابستہ سمجھیں، یہی وجہ ہے کہ حضرت محمدؐ کی وفات کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے سوچی سمجھی اسکیم کے تحت مکی سرداروں کی قیادت میں قبائل کو شام کی سرحدوں پر حملے کے لیے بھیجا، مقصود گویا یہ دیکھنا تھا کہ اگر قبائل کی توجہ دوسرے ملکوں کی طرف پھیر دی جائے تو ان پر اس کا کیا ردعمل ہوگا، اس میں کامیابی ہوئی تو پھر جنگوں اور فتوحات کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔[1]

---

[1] Studies on The Civilization of Islam, London, 1962 p. 6

تعبیر کا یہ وہ انداز ہے جسے ہم سرتاسر معاشی و مادی انداز فکر کہتے ہیں، اس میں آپ کو دین اسلام کی انقلابی و اصلاحی تعلیمات کی تاریخ ساز کارفرمائی کہیں نظر نہیں آئے گی، یعنی یہ کہ بدوی قبائل نے اسلام کو اس کے اپنے انسانی و روحانی اصولوں کی بنا پر نہیں اپنایا، بلکہ جب انھوں نے دیکھا کہ اس سے ان کا دنیوی و معاشی مفاد وابستہ ہے تو اسلام سے انھیں تعلق پیدا ہوا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گب نے اپنے ذہن میں ایک کلیہ قائم کیا اور پھر شام و عراق میں اسلامی فتوحات کو اسی کلیہ کی روشنی میں پیش کرنے کی کوشش کی، ہمارے نزدیک یہ رویہ فن تاریخ نگاری کے جدید اصولوں کے مطابق بھی نہیں ہے، اس لیے کہ اس رویہ سے اسی تاریخی معروضیت کا وقار مجروح ہوتا ہے جس پر مغرب کے جدید محققین ناز کرتے ہیں۔

یہی رویہ گب کا حدیث کے بارے میں ہے، اسی مضمون میں وہ اپنے قاری کو حسن بیان اور اپنے مخصوص طرز استدلال سے مسحور کر کے یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ پہلی صدی ہجری کے ختم ہوتے ہوتے چونکہ قانون اور اس کے نفاذ کا پُرپیچ مسئلہ پیدا ہو گیا تھا، اور صورت یہ تھی کہ خلافت کے مختلف شہروں اور صوبوں میں مقامی علماء اپنی اپنی فہم کے مطابق آزادانہ رائے دیتے تھے جو بسا اوقات باہم مختلف اور متضاد ہوتی تھیں اور اس پر مستزاد تھیں عرف و عادت، اور انتظامی ضوابط سے پیدا ہونے والی پیچیدگیاں، اس لیے مذہبی رہنماؤں نے اس صورت حال کو خطرناک سمجھا، خاص طور پر جب مقامی قوانین قرآن کے اخلاقی اصولوں سے متصادم معلوم ہوتے تھے، اس مسئلہ کا حل انھوں نے یہ ڈھونڈا کہ پیغمبر اسلامؐ کے معاصرین کے واسطہ سے "احادیث" بیان کرنی شروع کر دیں، جن میں واضح مسائل سے متعلق حضرت محمدؐ سے روایتیں منقول ہوتی تھیں اور پھر یہ کہا کہ ان احادیث کی پابندی ضروری ہے اور یہ کہ ان کی حیثیت آیات قرآنی سے مشکل ہی کمتر قرار دی جا سکتی ہے، اسی سلسلہ میں آگے چل کر جہاں وہ حدیث اور علم حدیث کی تدوین کا ذکر

کرتے ہیں تو وہ اسے علمائے حدیث کی "مصنوعی تخلیق" سے تعبیر کرتے ہیں، ہم یہ نہیں سمجھتے کہ پروفیسر گب
حدیث لٹریچر کے ارتقاء سے قطعی ناواقف ہوں گے یا انھیں اس "اسوۂ حسنہ" کا علم نہ ہوگا جس کا واضح
ذکر قرآن کریم میں ہے، اس لیے اس کے علاوہ اور کیا کہیے کہ وہ اپنی مذکورہ بالا تشریح اور "مصنوعی
تخلیق" جیسے الفاظ و تراکیب سے حدیث کے اس دینی وزن اور تشریعی اہمیت کو اپنے مسلمان
قاریوں کی نظر میں کم کرنا چاہتے ہیں جو ان کے دل میں اپنے محبوب پیغمبر سے اس کی اٹوٹ نسبت
کی وجہ سے جاگزیں ہے اور جو گذشتہ چودہ سو برس میں اسلامی مذہبی ثقافت کے تسلسل و ارتقاء میں
بنیادی حیثیت کی حامل رہی ہے۔

دوسری بات یہ کہ پروفیسر گب نے اپنے طریقہ سے وہی نقطۂ نظر دہرایا ہے جو حدیث کے
سلسلہ میں گولڈ تسیہر، مارگولیتھ اور لیمنس وغیرہ کا تھا اور جس کی کمزوریاں مسلمان علماء و محققین
پہلے ہی واشگاف کر چکے ہیں[1]۔

یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ پروفیسر گب کو سلطان صلاح الدین ایوبی کی شخصیت سے
گہرا شغف تھا، انھوں نے بارہویں صدی عیسوی کی اس پرکشش اور غیر معمولی اسلامی شخصیت کا گہرا
مطالعہ کیا اور ہر پہلو سے کیا، 'The Armies of Saladin' کے عنوان سے ان کے
مضامین جدید طرز کی تحقیق و تفحص کے اعلیٰ معیار کے نمونے ہیں، جہاں تک ہمیں علم ہے اس موضوع
پر اس دور کے مسلمان عالموں اور دانشوروں میں اس پایے کی تحقیق کا سراغ نہیں ملتا، لیکن
سلطان صلاح الدین پر گب کا معرکۃ الآرا مضمون The Achievement
of Saladin کے عنوان سے ہے، اس مضمون میں انھوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ

۱ دیکھیے: سیرۃ النبی جلد اول از علامہ شبلی نعمانی؛ مقالات سلیمانی جلد دوم از سید سلیمان ندوی
اور اسلام از فضل الرحمن (لندن، ۱۹۶۶)

صلاح الدین ایوبی ایسی شخصیتوں میں سے نہیں تھے جو محض اپنے گرد و پیش کے حالات کی پروردہ
ہوتی ہیں، بلکہ انھوں نے خود ایک بڑے مقصد کے لیے اپنی دینی اخلاق کے سہارے نہ صرف حالات
کو اپنے موافق بنایا، بلکہ نئے حالات پیدا کیے اور سیاسی انحطاط اور اخلاقی زوال کے اس عہد میں
اسلام اور مسلمانوں کی آبرو باقی رکھی۔

پروفیسر گب نے لکھا ہے کہ عہد وسطیٰ کی تاریخ سے متعلق شاذ و نادر ہی ایسے مستند ماخذ
ملتے ہیں جن کی مدد سے صحیح اور مثبت نتیجے نکالے جاسکیں اور جو تاریخی تنقید کے سخت سے سخت
معیار پر بالکل کھرے ثابت ہوں، لیکن سلطان صلاح الدین کی زندگی اور کارناموں سے متعلق خوش قسمتی
سے عربی زبان میں اسی زمانہ کے پانچ مراجع دستیاب ہیں، ابن ابی طے، ابن الاثیر (الکامل فی التاریخ)
قاضی بہاء الدین ابن شداد (النوادر السلطانیۃ) عماد الدین (البرق الشامی) اور القاضی الفاضل،
گب نے ان پانچوں کتابوں اور تحریروں کو ہر پہلو سے جانچا ہے اور ان کی خوبیوں اور کمزوریوں کو
تحقیق کے اعلیٰ معیار پر پرکھا ہے، ان مراجع میں وہ بہاء الدین، عماد الدین اور القاضی الفاضل
کی تحریروں کو جو سلطان سے بہت قریب اور اس کی زندگی کے ہر گوشہ سے واقف تھے، سب سے
زیادہ اہم قرار دیتے ہیں، اور انہی سے استفادہ کرکے وہ اس نتیجے پر پہونچے ہیں کہ صدیوں
بعد یہ دیکھنے میں آیا کہ ایک مسلم حکمراں مسلسل تین سال تک میدان جنگ میں اپنی افواج کے ساتھ اپنے
ایک متحدہ دشمن کے مقابلہ میں ڈٹا رہا، جب کہ اس عہد کا فیوڈل فوجی نظام ایسی طویل جنگ کا مشکل
تحمل ہوسکتا تھا[1]، اور ان کے خیال میں یہ صورت صرف اس وجہ سے ممکن ہوسکی کہ باوجود اس کے کہ
سلطان صلاح الدین کوئی بڑے ماہر جنگ یا تجربہ کار حکمراں نہ تھے، وہی ایک ایسی شخصیت تھی جو صلیبی
حملہ آوروں کے خلاف مسلمانوں کے مختلف النوع عناصر اور ان کی باہم متصادم سیاسی قوتوں کو اتحاد

۱ Studies on the Civilization of Islam, p. 104

کے لیے ایک مرکز پر متحد و مجتمع کرسکتی تھی، ہمت و شجاعت اور صبر و استقامت، ان سب اخلاقی
خوبیوں سے تو وہ متصف تھے ہی، اور یہ سب ان کے کام بھی آئیں، لیکن ان کی کامیابی میں ان
خوبیوں سے زیادہ دخل تھا ان کی بے غرضی و بے لوثی، سخاوت و فیاضی اور اخلاق اسلامی کے اثبات
برتری کو، جنھیں سلطان صلاح الدین نے دوست اور دشمن سبھی کے ساتھ یکساں برتا، وہ سادہ لوح
نہ تھے لیکن ان میں غضب کا انکسار اور سادگی تھی، ان کی ایمانداری بے داغ تھی اور بلور کی سی چمک
رکھتی تھی، ان کے دشمن حیران تھے کہ ان کی اس بات پر کہ سیاست اور جنگ دونوں میدانوں میں
ان کے عزائم اور ان کے طور طریقے کیوں مختلف ہیں، مکر و فریب سے وہ کوسوں دور تھے اور
دوسروں کے مکر و فریب کو شاذ ہی سمجھ پاتے تھے، ان کے اسلامی اخلاق نے انھیں معاہدوں کا
احترام سکھایا تھا، وہ ہر قیمت پر معاہدوں اور وعدوں کی پابندی کرتے تھے، اور معاہدہ توڑنے والے
دشمن کو ہمہ وقت یہ خیال رہتا تھا کہ اسے عہد شکنی کی بھاری قیمت ادا کرنی ہوگی[1]

ہمارا خیال ہے کہ شاید ہی کسی عیسائی مورخ یا سوانح نگار نے مستند معاصر ماخذوں کی
اچھی طرح چھان بین کے بعد اور تاریخی تنقید کے سارے اصولوں کو برت کر سلطان صلاح الدین
کی ایسی خوبصورت اور سچی تصویر پیش کی ہو۔

لیکن تاریخ و ادب سے ہٹ کر جب پروفیسر گب قرآن پاک اور سیرت رسولؐ کے موضوع
پر لکھتے ہیں تو اکثر مقامات پر وہ اپنی تاریخی بصیرت اور علمی معروضیت سے بے وفائی کرتے نظر
آتے ہیں، ان کے اس رویہ کی توجیہ اس کے علاوہ اور کیا ہوسکتی ہے کہ ان کے مذہبی عقائد اور
اس میدان میں تعصب اور جانب داری کی وہ روایات جو انھیں اپنے علمی ماحول اور اپنے پیش روؤں سے
ورثہ میں ملی تھیں، ان کا راستہ روک کر کھڑی ہو جاتی ہیں۔

---

[1] Studies on the Civilization of Islam, p.99

قبل اس کے کہ دو تین مثالوں سے ہم اپنے اس خیال کی وضاحت کریں، مناسب معلوم ہوتا ہے
کہ ہم ان کا ایک قول یہاں نقل کردیں، اپنی کتاب Modern Trends in Islam
کے پیش لفظ میں وہ لکھتے ہیں کہ "ان استعاروں سے جن میں عیسائی عقیدہ روایتی طور پر محفوظ ہے
ذہنی طور پر میری تشفی ہو جاتی ہے، کیونکہ یہ استعارے اور علامتیں روحانی صداقت کی ان بلند ترین
عظمتوں کی ترجمان ہیں جہاں تک میری فہم کی رسائی ہے، بشرطیکہ ان علامتوں اور استعاروں کی
تشریح ایسی زبان میں کی جائے جس سے کسی تجسیمی و تشبیہی عقیدے کا اظہار نہ ہوتا ہو، بلکہ ایسے عمومی تصورات
کی صورت میں ان کا بیان ہو جو کائنات سے متعلق ہمارے بدلتے ہوئے نظریوں سے مطابقت رکھتے ہوں"[1]

قطع نظر اس کے کہ گب کے اس قول کے حقیقی مآلہ اور ماعلیہ کیا ہیں، اتنی بات صاف ہے کہ وہ
عقیدۃً پکے عیسائی تھے، اور ہمارے نزدیک انھیں اس کا حق تھا کہ جس عقیدہ میں انھیں ذہنی
و روحانی تسکین حاصل تھی، اسے وہ اپناتے، یہ بات خوشی کی ہے کہ وہ مسلمانوں کو بھی اس کا حق دیتے تھے
اور اسی لیے ان سے توقع کی جاتی تھی کہ وہ مسلمانوں کے عقائد اور حضورؐ کی سیرت اقدس پر لکھتے وقت
انصاف سے کام لیں گے، ہمارا خیال ہے کہ اس سلسلہ میں ان کی "عیسائیت" تاریخی معروضیت اور
مذاہب کے تقابلی مطالعہ کی اس بنیادی خصوصیت پر غالب آگئی جسے آج سے صدیوں پہلے ایک مسلمان
عالم اور دانشور ابوریحان البیرونی نے الآثار الباقیہ اور کتاب الہند کی تصنیف کے سلسلہ میں اپنایا تھا
دوسروں کے مذہبی عقائد اور مذہبی روایات کے موضوعات پر لکھنے کی آزادی ہے، کسی ایک
خاص مذہب کا پیرو دوسرے مذاہب کا مطالعہ کرسکتا ہے اور اپنے مطالعہ کے نتائج قلمبند بھی کرسکتا ہے،
لیکن اس سلسلہ میں تصنیف و تالیف کا اولین اور بنیادی اصول یہ ہونا چاہیے کہ پہلے زیر مطالعہ مذہب کے
ماننے والوں کے عقائد پوری وضاحت کے ساتھ مکمل طور پر اس طرح بیان کردیے جائیں کہ اس تشکیک کی

---

[1] Modern Trends in Islam, Chicago. 1945, P. xi

کوئی گنجائش باقی نہ رہے کہ ان کے عقائد کو غلط طور پر یا توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا ہے، اب اگر لکھنے والا
کسی اور نظریے یا عقیدے کا حامل ہے اور وہ اپنے نظریے یا کسی اور کے نظریے کا ذکر کرنا چاہتا ہے
تو اسے اس کا حق حاصل ہے، لیکن اسے چاہیے کہ وہ اپنے یا کسی دوسرے کے نظریے کو الگ سے
اور پوری وضاحت سے پیش کرے۔

افسوس ہے کہ مستشرقین قرآن پاک اور سیرت پر لکھتے وقت اس بنیادی اصول کو عموماً فراموش
کر دیتے ہیں، اور کچھ اس طرح کا خلط بحث کرتے ہیں کہ صرف وہی لوگ جن کا اسلام کا مطالعہ اچھا
ہے، یہ محسوس کر سکتے ہیں کہ لکھنے والا اپنے ذاتی خیال اور عقیدے کو اپنے قاریوں کے ذہن میں اتار دینا
چاہتا ہے، حیرت ہے کہ پروفیسر گب جیسا بالغ نظر مصنف بھی جس کی علمیت و متانت کے
بہت سے مسلمان بھی معترف ہیں، اپنا دامن اس عیب سے پاک نہ رکھ سکا۔

پروفیسر گب نے اسلام پر جو کتاب لکھی ہے اس کا نام محمڈن ازم ہے، مارگولیتھ کی کتاب
اسی نام سے سنہ ۱۹۱۱ء میں چھپی تھی، پروفیسر گب نے اس خیال سے کہ بقول ان کے سنہ ۱۹۱۱ء کی
علمی فضا اور تھی، نظریے اور تھے، ذہنی و جذباتی تحدیدات مختلف تھے، اور چونکہ ہر دور کے
ذہنی تحفظات و تعصبات کی پرچھائیں اس دور کی تحریروں میں باقی رہتی ہے، خواہ ان سے بچنے کی
کتنی ہی کوشش کیوں نہ کی جائے، اس لیے انھوں نے اسلام پر ایک نئی کتاب کا لکھنا ضروری سمجھا۔

وہ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ مسلمانوں کو یہ پسند نہیں کہ انھیں محمڈن اور اسلام کو محمڈن ازم
کہا جائے، لیکن اس کے باوجود انھوں نے اسلام کو محمڈن ازم کہنا ضروری سمجھا، ان کے خیال میں
ایسا کہنا غلط بھی نہیں، کیونکہ ابھی زیادہ عرصہ نہیں گذرا کہ مسلمان بڑے فخر سے اپنے آپ کو "امت محمدیہ"
کہتے تھے، دوسرے یہ کہ جب مسلمان لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہہ کر اسلام پر اپنے یقین کا
اقرار کرتے ہیں تو اس کلمہ کے دوسرے حصہ کی اہمیت ان کے ذہن میں اس کے تمام مضمرات کے ساتھ

خصوصیت کے ساتھ موجود رہتی ہے، کیونکہ کلمہ کے پہلے حصہ پر مسلمانوں کے علاوہ بہت سے غیر مسلموں کا
بھی اعتقاد و ایمان ہو سکتا ہے، حضرت محمدؐ کے زمانہ سے لے کر اب تک کوئی ایسی مثال نہیں کہ اس کلمہ کے
دوسرے حصے کے منکرین کو کبھی مسلم کہا گیا ہو، یا انھیں اسلامی برادری کا رکن سمجھا گیا ہو، برخلاف اس کے
راسخ العقیدہ شارحین اسلام کا موقف ہر دور میں یہی رہا ہے کہ کسی ایسے شخص کو جو علانیہ پورے کلمہ کا
اقرار کرتا ہو، غیر مسلم نہیں کہا جا سکتا ہے[۱]

دیکھا آپ نے، کتنی چابکدستی سے اور کتنے لطیف پیرایے میں پروفیسر گب نے محمڈن ازم کی
اصطلاح کو برحق ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، درحقیقت اس ضمن میں وہ مارگولیتھ ہی کے پیرو ہیں
اور ان دونوں کی کتابوں کے مشمولات میں بڑی حد تک یکسانیت بھی ہے، اس لیے ان کی اس بات کا
کھوکھلا پن صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ مارگولیتھ کے زمانہ کی علمی فضا اور تھی اور آج کی اور ہے،
مسلمان یہ چاہتے ہیں کہ انھیں مسلم کہا جائے، لیکن کہا یہ جاتا ہے کہ محمڈن کہنا بھی بیجا اور غلط نہیں،
قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ خدا کو ایک اور صرف ایک ماننے والے اور محمدؐ کو رسول اور آپؐ پر ختم نبوت کا
اقرار کرنے والے "مسلم" ہیں، لیکن پروفیسر گب اپنے مسلم اور غیر مسلم قاریوں کو یہ بتاتے ہیں کہ اسلام کے لیے
محمڈن ازم اور "مسلم" کے لیے محمڈن کی اصطلاح بھی صحیح ہے، دراصل یہ ذہنی تعصب اور اسلام کو مسخ
کر کے پیش کرنے کا جذبہ ہے جو صدیوں سے عیسائی دنیا پر مسلط ہے، اور کسی نہ کسی شکل میں ظاہر
ہوتا رہتا ہے۔

اپنی اس کتاب کے پہلے ہی صفحہ پر پروفیسر گب یہ کہتے ہیں کہ "اسلام" کا لفظ حضرت محمدؐ نے
بعد میں اپنے مذہب کے امتیازی نام کے طور پر اختیار کیا، دراصل ان کا یہ نظریہ ان کی اس بحث کا
پیش خیمہ ہے جو انھوں نے کتاب کے تیسرے باب میں جس کا عنوان "قرآن" ہے، اٹھائی ہے، یہ

---

[۱] Mohammadanism, Newyork, 1966 (fifth edition) p.2

بتاتے ہوئے کہ کس طرح پیغمبر اسلامؐ کے ذہن میں نظریۂ توحید کا ارتقاء ہوا ہوگا' ان کا کہنا ہے کہ قرآن میں توحید کا جو نظریہ پیش کیا گیا ہے' اس کا تعلق درحقیقت ان "حنفاء" کے اعتقاد سے ہے جس کے بارے میں ہمیں کچھ زیادہ معلوم نہیں، حضرت محمدؐ نے اس پر فخر کیا اور اسے حضرت ابراہیمؑ سے ایک امتیازی شان کے ساتھ وابستہ کر دیا، قرآن کی اس آیت مَا كَانَ إِبْرَاهِيمُ يَهُودِيًّا وَلَا نَصْرَانِيًّا وَلَٰكِن كَانَ حَنِيفًا مُّسْلِمًا کی ایک ابتدائی شکل (قراءت: Reading) میں جو اس سے مختلف تھی' اس بات کا اشارہ موجود تھا کہ حضرت محمدؐ جس عقیدہ کی تبلیغ کرتے تھے اس کے لیے حنیفیۃ کا لفظ استعمال کیا جاتا تھا، یہ تو بعد میں ہوا کہ حنیفیۃ کی جگہ اسلام نے لے لی[1]

بیان القرآن (طبری) تفسیر کبیر (رازی) درالمنثور (سیوطی) روح المعانی (آلوسی) اور فتح البیان (صدیق حسن قنوجی) میں سے کسی میں بھی آیت مذکورہ کی کسی مختلف قراءت "Variant reading"[2] کا سراغ نہیں ملا، اور خود پروفیسر موصوف نے کوئی حوالہ نہیں دیا ہے، ایسی صورت میں جہاں تک ہم سمجھتے ہیں کسی کمزور روایت کا سہارا لے کر یا خود اپنے طور پر پروفیسر گب نے یہ قیاس آرائی کی ہے کہ پہلے حضرت محمدؐ نے اپنے عقیدۂ توحید کو حنیفیۃ سے تعبیر کیا اور بعد میں اسلام کہا۔

درحقیقت تخیل کا یہ سارا فساد اس لیے ہے کہ پروفیسر گب قرآن کریم کو وحی الٰہی کے بجائے پیغمبر اسلامؐ کی تصنیف سمجھتے ہیں، چنانچہ محمڈن ازم کے تیسرے باب کا آغاز ہی اس جملہ سے ہوتا ہے:

The Koran is the record of those formal utterances and discourses which Mohammad and his followers accepted as directly inspired[3]

جب سے مغرب کی علمی دنیا میں سائنٹفک تاریخی اصول تحقیق کا چرچا ہوا' اُس وقت سے مستشرقین

---

[1] Mohammedanism p 38 [2] ایضاً [3] ایضاً p.33

یہ ثابت کرنے میں لگے ہوئے ہیں کہ قرآن کی اساس یہودی و نصرانی روایات ہیں، پروفیسر گب نے بھی مختلف انداز سے یہی بات کہی ہے، غرض پچھلے دو تین سو برس کی طویل مدت میں اس سلسلہ میں بڑی بڑی قیاس آرائیاں کی گئی ہیں' اور ان قیاس آرائیوں سے دوررس تاریخی' ادبی اور دینیاتی نتائج نکالے گئے ہیں، اور پھر اس مفروضے اور ان نتائج کو اتنی بار دُہرایا گیا ہے کہ انھیں حقیقت و واقعیت کا مرتبہ حاصل ہو گیا ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ آج بھی یہ مفروضہ ویسے ہی ایک مفروضہ ہے جیسے دو سو[200] سال پہلے تھا۔

کیسی عجیب بات ہے کہ ایک طویل عرصہ تک تمام ذہنی و مادی وسائل کے ساتھ تاریخی تنقید و تحقیق کے جدید اصولوں کو برت کر عیسائی دنیا اس بات کا کوئی قطعی اور فیصلہ کن ثبوت فراہم نہ کر سکی کہ قرآن کریم پیغمبر اسلامؐ کی تالیف ہے، جسے آپؐ نے یہودی و عیسائی روایات سے استفادہ کر کے اور توراۃ و انجیل سے بہت کچھ مستعار لے کر مرتب کیا، اس سلسلہ میں ہمارے نزدیک اگر کوئی معاصر اور زندہ شہادت ہے تو وہ خود قرآن کی ہے جس سے اس طرح کا کوئی امکان خارج از بحث قرار پاتا ہے، تاریخی تنقید و تحقیق کے مستند اور جدید اصول کے مطابق اس بولتی ہوئی معاصر دستاویز کی شہادت کو جس کے علاوہ اس مرتبہ کی کوئی اور شہادت موجود نہیں، تمام لایعنی قیاس آرائیوں سے بالاتر اور یقینی سمجھنا چاہیے، لیکن مستشرقین اس زندہ حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں، کیونکہ اس سے ان کے نظریے اور عقیدے کی مکمل طور پر نفی اور تردید ہوتی ہے۔

رسول اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زندگی کی پوری تفصیلات موجود ہیں، کسی دوسرے نبیؑ یا دنیا کی بڑی سے بڑی شخصیت کے حالات ہمیں اتنی تفصیل سے نہیں معلوم ہیں، لیکن پروفیسر گب اس سلسلہ میں اپنے قارئین کو شبہہ میں مبتلا کرنا ضروری سمجھتے ہیں، اس لیے وہ بڑی چابکدستی سے آپؐ کے بچپن سے لے کر بعثت تک کے حالات و واقعات نظر انداز کر دیتے ہیں، بعثت سے قبل کی

آپ کی پاک صاف زندگی، بے مثال امانت و دیانت، دانشمندی و بصیرت، اہل مکہ کی اخلاقی پستی پر آپ کی غمگینی و دلسوزی، کمزوروں، مظلوموں، مسافروں اور اجنبیوں کی بیکسی و بے بسی پر آپ کا جذبۂ دردمندی اور گرد و پیش کے عمومی حالات پر آپ کی روحانی بے چینی ان سب باتوں میں آپ کی انسانی عظمت کے کوئی آثار انھیں نظر نہیں آتے، اور تاریخی معروضیت کے تمام تر بلند بانگ دعووں کے باوجود بالکل مارگولیتھ کے انداز پر پروفیسر گب کو یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ "پیغمبر اسلام کی شروع کی زندگی اور حالات سے متعلق ہمیں یقین کے ساتھ کچھ نہیں معلوم[۲]" اور یہ کہ "ان کی کامیابی کی وجہ یہ تھی کہ وہ مکّہ کے رہنے والے تھے[۳]" ع ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے۔

اب جب پروفیسر گب جیسے شریف طبیعت اور سنجیدہ عالم کو جن کا شمار صف اول کے مستشرقین میں کیا جاتا ہے، اور جن کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ اسلام کا مطالعہ ایک ایسے عیسائی کی حیثیت سے کرتے تھے جسے دونوں مذاہب میں مشترک روحانی اقدار کی تلاش تھی، قرآن پاک کو یہودی عیسائی روایات سے مستعار سمجھنے اور وحی الٰہی نہ ماننے پر اصرار ہو اور پیغمبر اسلام کی سیرت میں انسانی و روحانی عظمت کا کوئی پہلو نظر نہ آتا ہو، تصور وحی، منصب نبوت اور شعور نبوت سے متعلق اسلامی موقف کا کوئی شعور نہ ہو تو بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ دوسری صف کے مستشرقین مثلاً گیلوم (Guillaume)، روزینتھال (Rosenthal)، برنارڈ لوئیس (B. Lewis)، گرونے بام (Grunebaum)، مونٹگمری واٹ (M. Watt)، اینڈرسن (Anderson)، جوزف شاخت (J. Schacht) اور کینتھ کریگ (K. Cragg) وغیرہم نے قرآن پاک اور سیرت اقدس سے متعلق کیا کیا گل افشانیاں کی ہوں گی۔

ل Margoliouth, Mohammedanism, London, 1911 (?) pp. 51-52

۲ Mohammedanism p. 24 ۳ ایضاً ص ۲۵۔

الواحُ الصَّنادِید

از

پروفیسر محمد اسلم استاد شعبۂ تاریخ پنجاب یونیورسٹی، لاہور

(۲)

لاہور کے گورستان میانی میں جتنے علما، ادبا اور شعرا دفن ہیں، اس کا عشر عشیر بھی کسی دوسرے قبرستان میں نظر نہیں آتا، ان مشاہیر کی قبروں کو دیکھ کر بے اختیار یہ مصرع زبان پر آتا ہے ع

زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

اسلامیہ پارک سے اگر فصیح روڈ کی طرف سے قبرستان میں داخل ہوں تو دائیں ہاتھ ایک ٹیلہ پر پٹی (حال ضلع امرتسر) کے مغلوں کی قبریں ہیں، ان ہی قبروں میں ایک قبر محمدی بیگم کی ہے، یہ وہی خاتون ہے جس کے بارے میں مرزا غلام احمد قادیانی نے اعلان کیا تھا کہ اُن کے ساتھ ان کا نکاح عرش معلی پر ہو چکا ہے، محمدی بیگم کے والدین نے مرزا صاحب کو زچ کرنے کی خاطر اُن کی شادی پٹی کے ایک نوجوان مرزا سلطان بیگ کے ساتھ کر دی، مرزا صاحب نے اس پر جز بز ہو کر کہا کہ وہ ضرور اُن کے نکاح میں ۔ ۔ ۔ آئیں گی، اگر وہ اُن کے نکاح میں نہ آئیں تو پھر ان کی کوئی بیٹی مرزا صاحب کے کسی بیٹے کے عقد میں آئے گی، یہ ایک لمبا قصہ ہے جس کی تفصیل کتابوں میں مل جاتی ہے، محمدی بیگم کا نکاح مدتوں تک مناظروں کا موضوع بنا رہا ہے، اُن کی لوح مزار پر یہ عبارت کندہ ہے"

۷۸۶

یا اللہ　　یا محمد

لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ

مرقد

محمدی بیگم مرحومہ

زوجہ

رسالدار مرزا سلطان محمد بیگ آف پٹی

تاریخ وفات ۱۹ نومبر ۱۹۶۶ء

محمدی بیگم کی قبر سے جانب شمال مشرق میں دو میٹر کے فاصلہ پر مرزا غلام احمد کے رقیب رسالدار سلطان بیگ محو خواب ابدی ہیں، ان کی لوح مزار پر یہ عبارت ہے،

۷۸۶

یا اللہ　　یا محمد

مرقد

رسالدار مرزا سلطان محمد بیگ آف پٹی

تاریخ وفات

۱۰ جنوری ۱۹۴۹ء

میانی صاحب کی عیدگاہ کی محراب کے عقب میں قبروں کا ایک وسیع احاطہ ہے، جو لاہور کے معروف فقیر خاندان کی ملک ہے، اس احاطہ میں مشہور ادیب اور ڈرامہ نگار حکیم احمد شجاع کی قبر ہے، ڈرامہ نگاری میں موصوف نے آغا حشر کا تتبع کیا ہے، ان کے ڈراموں میں سے باپ کا

گناہ، جان باز، آخری فرعون، بھارت کا لال اور حسن کی قیمت خاص طور پر قابل ذکر ہیں حکیم صاحب نے لاہور سے ایک رسالہ بعنوان ہزار داستان جاری کیا تھا، موجودہ صدی کے آغاز میں ٹیبل ٹاک ایک باقاعدہ فن تھا، یہ فن حکیم احمد شجاع کے ساتھ ہی ختم ہوگیا ہے، ان کی قبر پر جو کتبہ نصب ہے اس پر یہ عبارت ہے،

یا اللہ　　یا محمد

بسم اللہ الرحمن الرحیم

لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ

حکیم احمد شجاع

ولد

حکیم شجاع الدین الایوبی الانصاری

ادیب، شاعر، مصنف، مقرر، منصف، مفکر

تاریخ ولادت: ۴ر نومبر ۱۸۹۶ء

تاریخ وفات: ۴ر جنوری ۱۹۶۹ء

حکیم احمد شجاع کی قبر سے اندازاً پچاس میٹر جانب مشرق عیدگاہ کی محراب سے چند قدم کے فاصلہ پر کرنل فقیر وحید الدین آسودۂ خاک ہیں، کرنل صاحب مہاراجہ رنجیت سنگھ کے وزیر فقیر عزیز الدین کے خاندان کے چشم و چراغ تھے، انھوں نے اپنے خاندان کے مربی کے بارے میں دی ریل رنجیت سنگھ کے عنوان سے ایک کتاب لکھی ہے، اس کے علاوہ موصوف نے روزگار فقیر، انجمن اور حسن عالم کے عنوانات سے تین کتابیں اپنی یادگار چھوڑی ہیں، ان کی لوح مزار پر یہ عبارت کندہ ہے،

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یا اللہ

یا محمد

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

الحمد للہ .. .. والضالین

آخری آرامگاہ

کرنل فقیر سید وحید الدین

ولد

فقیر سید نجم الدین

پیدائش ۱۹۰۴ء

تاریخ وفات ۱۴ر جولائی ۱۹۶۸ء

مطابق ۱۹ر ربیع الثانی ۱۳۸۸ھ بروز منگل

چوبرجی سے مزنگ چونگی کی طرف جاتے ہوئے بہاول پور روڈ پر جہاں کوٹھیوں کا سلسلہ ختم ہوتا ہے، وہیں قبروں کے ایک احاطہ کے باہر سنگ مرمر کی سل لگی ہوئی ہے، جس پر "احاطہ مولوی سلطان احمد مرحوم" مرقوم ہے، احاطہ میں داخل ہوتے ہی پروفیسر عبد الحئی پرنسپل اسلامیہ کالج لاہور کی قبر ہے، اور اُن کے سرہانے ان کے بھائی عبد اللہ بٹ محو خوابِ ابدی ہیں عبد اللہ بٹ بڑے بلند پایہ صحافی تھے، انھوں نے متعدد کتابیں اپنی یادگار چھوڑی ہیں، ان کی تصانیف میں "ٹیپو سلطان، یادگارِ زمانہ ہیں یہ لوگ، مقالات شاہ اسمٰعیل شہید، راجہ اندر کسان، ابو الکلام آزاد اور مقالات آزاد خاص طور پر مشہور ہیں" بٹ صاحب کے برادرِ بزرگ ڈاکٹر عبد القیوم اردو انسائیکلوپیڈیا، کے سینیر ایڈیٹر ہیں، بٹ صاحب کی لوحِ مزار پر یہ عبارت ہے،

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

مرقد

عبد اللہ بٹ عمر ۵۰ سال

اڈیٹر "حرف و حکایت" لاہور

ولد فضل دین بٹ مرحوم

ملا نہ پھر کہیں لطفِ کلام تیرے بعد

حدیثِ شوق رہی ناتمام تیرے بعد

مرقد پہ تیری رحمتِ حق کا نزول ہو

حامی تیرا خدا اور خدا کا رسول ہو

تاریخ وفات ۲۹ر ستمبر ۱۹۶۸ء

نواب فخر یار جنگ مرحوم کی قبر سے اندازاً سو میٹر جانب جنوب ایک پرانے میں مشہور شاعر ساغر صدیقی کی قبر ہے، ساغر بہت اچھے شاعر تھے، ان کے کلام کے مجموعے "غمِ بہار، لوحِ جنوں، شبِ آگہی، شیشۂ دل، اور مقتلِ گل" کے عنوانات سے چھپ چکے ہیں، اُن کی عمر زیادہ نہیں ہوئی، انھوں نے گھٹیا قسم کا نشہ استعمال کرنا شروع کر دیا تھا، جو بالآخر جان لیوا ثابت ہوا، ان کی لوحِ مزار پر یہ عبارت ہے،

اللہ

حق حق حق

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وہاں اب تک سنا ہے سونے والے چونک اٹھتے ہیں

صدا دیتے ہوئے جن راستوں سے ہم گذر آئے (ساغر)

درویش شاعر صدیقی رحمتہ اللہ علیہ

تاریخ وصال ۱۹ر جولائی ۱۹۷۴ء لاہور

ساغر صدیقی مرگیا،

ایک شاعر مرگیا،

ایک فقیر مرگیا

ایک انسان مرگیا، سب مرجاتے ہیں، مرنا سب کو ہے لیکن کچھ زندہ رہ کر بھی مُردوں میں ہوتے ہیں، کچھ مرکر بھی زندہ رہتے ہیں، ساغر بھی انہی میں سے ہے، اس لئے کہ اسے اپنے عہد کے معاشرے نے قتل کیا، اور معاشرہ ساغر کا قاتل ہے، روشنی، سچائی، اور نیکی کا قاتل اس لئے کہ ساغر روشنی، سچائی اور نیکی کا پیغامبر تھا،

منجانب خواجہ محمد شفیع مبارک علی لاہور

(ساغر میموریل)

بھاول پور روڈ سے جو راستہ حضرت طاہر بندگیؒ کی درگاہ کی طرف جاتا ہے، اس سے اندازاً پچاس میٹر کے فاصلہ پر بر لب شاہراہ مشہور صحافی ابو سعید بزمی صاحب کی قبر ہے، وفات کے وقت موصوف روزنامہ احسان لاہور کے اڈیٹر تھے، وہ صحافیوں کے ایک وفد کے ساتھ امریکہ کا دورہ کر رہے تھے، کہ اچانک ہی لاس انجلیز میں فوت ہو گئے، بزمی صاحب نے تاریخ انقلاباتِ عالم، جب خون بہہ رہا تھا، ریاستوں کی سیاست، زندگی کے جائزے، اور "مولانا ابوالکلام آزاد تنقید اور تبصرہ کی نگاہ میں"، کے عنوانات سے چند کتابیں اپنی یادگار چھوڑی ہیں، بزمی صاحب کی لوح مزار پر یہ عبارت ہے،

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مرقد

سید ابو سعید بزمی

جو ۱۵ر ستمبر ۱۹۵۱ء کو لاس انجلیز (امریکہ) میں انتقال

فرماگئے، اور یہاں ان کی تدفین عمل میں لائی گئی،

انا للہ و انا الیہ راجعون

بزمی صاحب کی قبر سے چھ سات میٹر کے فاصلہ پر بوٹا پہلوان کی قبر کے پاس مشہور افسانہ نویس سعادت حسن منٹو کی قبر ہے، وفات سے کچھ عرصہ پہلے منٹو پر فحش نگاری کے جرم میں مقدمہ بھی چلا تھا، منٹو نے اپنی قبر کا کتبہ خود لکھا تھا، ان کی لوح مزار پر یہ عبارت ہے،

۷۸۶

میری قبر کا کتبہ

یہ

لوح

سعادت حسن منٹو کی قبر کی ہے

جو اب بھی سمجھتا ہے کہ اس کا نام

لوح جہاں پر

حرف مکرر نہیں تھا (منٹو)

پیدائش ۱۱ر مئی ۱۹۱۲ء وفات ۱۸ر جنوری ۱۹۵۵ء

ابو سعید بزمی صاحب کی قبر سے حضرت طاہر بندگیؒ کی درگاہ کی طرف چلیں تو اس کے موڑ پر ایک چبوترے پر سر شیخ عبدالقادر مدیر مخزن کی قبر ہے، اُن کی قبر پر ایک چھتری بنی ہوئی تھی جو حال ہی میں زمیں بوس ہو گئی ہے، اسی صدمے سے ان کی لوحِ مزار بھی ٹوٹ پھوٹ گئی ہے، جس وقت ان کی قبر کی لوح صحیح و سالم تھی، تو اس کے باہر کی جانب یہ عبارت تھی،

نوّر اللہ تربتھم

وادخلناھم بجنات نعیم

اللہ جلّ جلالہ

کا وہ خاکسار بندہ جس کے قلبِ متین میں زندگی کے مسلسل نشیب و فراز کے.....

دوران خاکساری اور تسلیم و رضا رجا گزیں رہی

جو علم پرور بھی تھا

اور

علم دوست بھی

اسے ڈھونڈا کریں گی اب نگاہیں

چراغِ محفلِ ادب، چراغ محفل ابد　　آفتابِ انجمن شیخ عبدالقادر

۱۳۶۹　　۱۹۵۰

لوحِ مزار پر اندر کی جانب یہ عبارت منقوش تھی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شیخ سر عبدالقادر

مدیر مخزن

پیدائش سنہ ۱۸۷۴ء　　وفات ۹ فروری سنہ ۱۹۵۰ء

شمع کی طرح جئیں بزم گہِ عالم میں

(اقبال)

خود جلیں دیدۂ اغیار کو بینا کر دیں

(ابجد پر دیں رقم)

سر شیخ عبدالقادر اردو زبان کے بہت بڑے محسن تھے، انھوں نے مخزن کے ذریعہ اقبال کو علمی حلقوں میں متعارف کرایا تھا، اقبال نے بانگ درا کا دیباچہ انہی سے لکھوایا تھا۔ شیخ عبدالقادر کی قبر سے چھ سات میٹر جانب شمال مشرق مزدور شاعر احسان دانش کی آخری آرامگاہ ہے لیکن اس پر ہنوز ابھی لوح نہیں لگی، شیخ صاحب کی قبر سے مغرب کی طرف اندازاً تین میٹر کے فاصلہ پر مشہور انشاء پرداز میاں عبدالعزیز فلک پیما آسودۂ خاک ہیں، ان کی نگارشات "مضامین فلک پیما" کے عنوان سے چھپ چکی ہیں، اس کتاب کے دیباچہ میں میاں بشیر احمد مدیر ہمایوں نے صاحبِ کتاب کا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے:-

"میانہ قد، گٹھیلا بدن، جسمانی و ذہنی صحت سے فیض یاب، چہرے پر رونق، آنکھوں میں ایک مطمئن نگاہ، دل کے طوفانوں کی پردہ دار، اپنے کام میں ماہر، گونا گوں تفریحات سے لطف اندوز، غلطیوں سے بے پرواہ، ناشائستگی سے متنفر، حسن کا ہوشمند شکار، معاشرتی آزادی کا علم بردار، محفلوں میں خون حیات دوڑانے والا، نفع رساں، غرض مند، سیاست، مذہب، فلسفہ، اس کے پھندے میں گرفتار، خوددار، متین، ظریف، جس کے خیالات میں گریز، درگریز، جس کی تحریر کی ہر دوسری سطر میں ایک انوکھی، اچھوتی بات، جس کی زبان میں آزاد منشی جب کی

طرزِ بیان میں بے ساختگی، یہ ہے فلک پیما کی ایک نامکمل سی تصویر،

فلک پیما، کی لوحِ مزار پر یہ عبارت ہے

۷۸۶

هوالعزیز

مرقد میاں عبدالعزیز (فلک پیما)

خلف الرشید حاجی شیخ محمد عوض

پیدائش:- ۱۸۷۹ء موچی دروازہ لاہور

وفات:- لاہور، ۷ مئی ۱۹۵۱ء

تاریخ وفات

بس کہ اس کا نام تھا عبدالعزیز

سال ذی عزت فلک پیما ہوا

۱۳۷۰ھ

اقرأ باسم ربک ...... مالم یعلم

آخری سطر میں اردو عبارت درج تھی، وہ اب سمینٹ کے نیچے دب گئی ہے،

حضرت طاہر بندگی کے مزار مبارک سے جنوب کی طرف اندازاً بیس میٹر کے فاصلہ پر مشہور صحافی اور ادیب مولانا محمد وارث کامل کی قبر ہے، مرحوم کافی عرصہ تک "مدینہ" بجنور اور ہفت روزہ چٹان لاہور کے عملۂ ادارت میں رہے، انھیں علامہ تاجور نجیب آبادی کا قرب حاصل تھا، انھوں نے محمد حسین ہیکل کی تصنیف سیرۃ الرسول کا اردو میں ترجمہ کیا ہے، اُن کی لوحِ مزار پر یہ عبارت ہے،

۷۸۶

ما عرفناک حق معرفتک

مولانا محمد وارث کامل مرحوم

بروز یک شنبہ مورخہ ۲۳ اکتوبر ۱۹۶۱ء

ہے فکر کہ ہو کندہ سرِ لوحِ مزار

تاریخ کوئی چاہیے محمد وارث

ہاتف نے کہا قمر یہ مصرع لکھ دو

دنیا سے اٹھ گئے محمد وارث

۱۳۸۰ھ

تخلص سے تو یہی مترشح ہوتا ہے، کہ یہ تاریخ قمر میرٹھی نے کہی تھی،

گورستانِ میانی صاحب کے عین وسط میں جنازہ گاہ اور غازی علم الدین شہید کے مزار کے درمیان، ایک قدآدم چبوترہ پر لاہوری مرزائیوں کی قبریں ہیں، ان میں سب سے نمایاں قبریں مولوی محمد علی لاہوری اور خواجہ کمال الدین کی ہیں، مولوی محمد علی کی ریلیجن آف اسلام اور قرآن حکیم کے انگریزی ترجمہ کی بہت شہرت ہوئی، مگر اس ترجمۂ قرآن کے بارے میں مولانا عبدالماجد دریابادی فرماتے ہیں، کہ اس میں بہت سی خامیاں ہیں، غلطیاں ہیں، بلکہ بعض جگہ تو ایسی جسارتیں کی گئی ہیں، کہ ان کے ڈانڈے تحریف سے مل جاتے ہیں،

مولوی صاحب کی لوحِ مزار پر یہ عبارت ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم،

ومن یطع اللہ والرسول فاولٰئک مع الذین انعم اللہ علیہم
من النبیین والصدیقین والشھداء والصّٰلحین وحسن اولٰئک رفیقا

مرقدِ پُر نور

مجاہدِ اعظم سلطان القلم مفسر قرآن مجید مبلغ دین اسلام وشہید قوم حضرت مولانا
محمد علی رحمۃ اللہ علیہ (ایم اے ایل ایل بی)

امیر جماعت وصدر احمدیہ انجمن اشاعت اسلام لاہور

جنھوں نے ۱۹۰۰ء میں اپنے زریں دنیاوی مستقبل کو قربان کر کے دین کو دنیا پر مقدم کرنے کا عملی نمونہ پیش کیا، اور مسلسل پچاس سال تک اسلام کی تائید اور دشمنانِ اسلام کے اعتراضات کے جواب میں پچاس ہزار صفحات تحریر فرمائے جو دنیا کی مختلف زبانوں میں شائع ہوئے، قرآن مجید کی تفاسیر لکھ کر معارف وحقائق کے ایسے دریا بہا دیئے، کہ ھو الذی ارسل رسولہ بالھدیٰ ودین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ کا نظارہ سامنے آگیا، اس عاشقِ قرآن کریم نے ترجمۃ القرآن انگریزی کے چوتھی اڈیشن کی مکمل نظر ثانی اور تکمیل کے بعد قرآن مجید کی اشاعت کی مستقل بنیاد رکھتے ہوئے، ۱۳ر اکتوبر ۱۹۵۱ء مطابق ۱۰ر محرم الحرام ۱۳۷۱ھ کو شہادت پائی
انا للہ وانا الیہ راجعون،

یاایتھا النفس المطمئنۃ ۰ ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ ۰ فادخلی
فی عبادی وادخلی جنتی

خواجہ کمال الدین مرزائیوں کی لاہوری جماعت کے بانی مبانی تھے، مولانا عبید اللہ سندھی کی یہ رائے ہے کہ پہلی عالمی جنگ کے دوران میں حسین شریف مکہ اور انگریزوں کے درمیان سودا بازی کرانے میں خواجہ کمال الدین نے اہم کردار ادا کیا تھا، موصوف کی لوحِ مزار پر

یہ عبارت ہے :-

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ومن احسن قولا ممن دعا الی اللہ وعمل صالحًا وقال اننی من المسلمین

مرقد

حضرت خواجہ کمال الدین صاحب الملقب بہ حسن بیان
مبلغ اسلام وبانی مسلم مشن ووکنگ انگلستان

یعنی شمع رسالت کا وہ پروانہ وبیقرار گلشنِ توحید کا وہ بلبلِ نغمہ سنج علم وفضل کا وہ بحرِ بیکراں تبلیغِ اسلام کا وہ عاشقِ دلدادہ جس نے اپنی زندگی کو اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے وقف کر دیا، اور کفرستانِ فرنگ میں برابر ۲۰ بیس سال علمِ توحید بلند رکھا، اور جو ۶۳ سال کی عمر میں بتاریخ ۲۹ر شعبان المعظم ۱۳۵۱ھ .. ..

(یہاں ایک سطر اور تھی جو اب سیمنٹ میں دب گئی ہے،)

خواجہ کمال الدین کی وفات دسمبر ۱۹۳۲ء میں ہوئی تھی، مولوی محمد علی اور خواجہ کمال الدین کی قبروں کے کتبے دیکھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ مرزائی خدمتِ اسلام کے کتنے بلند بانگ دعوے کرنے کے عادی ہیں،

گلبرگ کے ڈی بلاک میں سڑک کے کنارے ایک چھوٹا سا قبرستان ہے، اس قبرستان کے شمال مشرقی کونے میں پنجاب یونیورسٹی لاہور کے سابق وائس چانسلر پروفیسر حمید احمد خاں محوِ خواب ابدی ہیں، پروفیسر موصوف مولانا ظفر علی خاں کے حقیقی بھائی تھے،

حمید احمد خاں مرحوم انگریزی پڑھانے اور اردو لکھتے تھے، ان کا شمار اردو زبان کے اچھے انشا پردازوں میں ہوتا ہے، یونیورسٹی کی ملازمت سے سبکدوش

ہونے کے بعد موصوف ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ اور مجلسِ ترقیٔ ادب سے وابستہ رہے، انھوں نے حضور ختمی مرتبت کی سیرت پر ایک کتاب اپنی یادگار چھوڑی ہے، ان کی قبر پر جو سنگ مرمر لگا ہوا ہے، اس کی مالیت ۱۲ ہزار روپیے بتائی جاتی ہے، ان کی قبر کی تعویز پر یہ عبارت ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

والذین آمنوا وعملوا الصّٰلحٰت اولٰئک اصحاب الجنۃ ھم فیہا خٰلدون،

پروفیسر حمید احمد خاں

۱۰ رشعبان ۱۳۲۱ھ   ۲۷ رصفر ۱۳۹۴ھ

یکم نومبر ۱۹۰۳ء   ۲۲ رمارچ ۱۹۷۴ء

چوں بمیرم از غبار من چراغِ لالہ ساز

تازہ کن داغِ مرا، سوزاں بہ صحرائے مرا

گلبرگ میں کئی قبرستان ہیں جن میں سے ایک گوروہانگٹ کا قبرستان کہلاتا ہے، اس قبرستان کے وسط میں سب سے نمایاں قبر مشہور افسانہ نویس و ناول نگار خدیجہ مستور کی ہے، ان کے افسانوں کے دو مجموعے کھیل اور بوچھاڑ کے نام سے چھپ چکے ہیں، ان کو ان کے ایک ناول آنگن پر آدم جی ایوارڈ بھی ملا تھا، ان کا انتقال لندن کے ایک ہسپتال میں ہوا، اور ان کی میت لاہور لاکر دفن کی گئی، اُن کی لوح مزار کے باہر کی جانب یہ عبارت ہے،

النصیر

خدیجہ مستور

تاریخ وفات

۲۶ رجولائی ۱۹۸۲ء

قصرِ خلد آنکھوں میں، پھر بھی لب پہ قدرِ آفاق کی

مرتے دم تک یہ بصیرت وجہِ حیرت ہے بہت

بجھ رہی تھی شمعِ ہستی، تب خدیجہ نے کہا:

ماہ و انجم کی یہ دنیا خوبصورت ہے بہت

۱۹۶۸۲

لوح کے اندر کی جانب یہ عبارت ہے:

السّتّار

خدیجہ مستور

زوجہ

ظہیر بابر

والدہ

پرونیہ بابر ۵ کرن بابر

چمنِ عشقِ نبی میں آقا   اٹھیں نکہاتِ خدیجہ مستور

اسی گنجِ پوشش لحد سے ابھری   ماہ درجاتِ خدیجہ مستور

۱۹۶۸۲

اسی قبرستان کے شمالی مغربی کونے میں پاکستان کے سابق چیف جسٹس محمد منیر کی قبر ہے، منیر صاحب نے گورنر جنرل غلام محمد کے پارلیمنٹ توڑنے کے اقدام کو جائز قرار دیکر پاکستان میں جمہوری نظام کا گلا دبا دیا تھا، ۱۹۵۳ء میں جب قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے کیلئے تحریک چلی تھی، تو اس تحریک کے خاتمہ پر موصوف ہی کو ایک تحقیقاتی کمیشن کا سربراہ مقرر کیا گیا تھا،

انھوں نے اس تحریک کے بارے میں جو رپورٹ پیش کی تھی، وہ منیر رپورٹ کے نام سے مشہور ہے، ان کو دینی اور سیاسی حلقوں میں ناپسند کیا جاتا ہے، ان کی لوحِ مزار پر یہ عبارت ہے :-

۷۸۶

محمد منیر

چیف جسٹس پاکستان

چیف جسٹس لاہور ہائی کورٹ

ممبر پنجاب باؤنڈری کمیشن

ولد

ڈاکٹر محمد بخش

۳ مئی ۱۸۹۵ء ، ۲۶ جون ۱۹۸۱ء

ماہنامہ معارف بابت ماہ اگست ۱۹۸۲ء میں شاعر رومان اختر شیرانی کی لوحِ مزار کے شعر میں کتابت کی غلطی ہوگئی ہے اصل شعر یوں ہے :

داماں خدا بہ زاریں ہے

اک شاعر نوجوان کی تربت

دارالمصنفین کی ادبی خدمات

دارالمصنفین کی ادبی خدمات پر ڈاکٹر خورشید نعمانی ردولوی کی ایک محققانہ پر ازمعلومات کتاب جسکا انتساب فاضل مصنف نے اپنے مربی مولانا شاہ معین الدین ندوی کے نام کیا ہے۔

قیمت :- ۲۰/ روپیے

منیجر

اسلام اور مستشرقین

پر

دارالمصنفین کا بین الاقوامی سیمینار

از

سید صباح الدین عبدالرحمن

(۸)

ڈاکٹر عبدالصبور مرزوقی کی اہم تقریر کے بعد جلسہ کے ناظم جناب ڈاکٹر سید سلمان ندوی نے ان مقالہ نگاروں کے نام کا اعلان کیا جن کے مقالے وقت کی کمی کی وجہ سے پڑھے نہ جا سکے، ان سے معذرت کی گئی اور یقین دلایا گیا کہ یہ مقالے آیندہ شایع ہوں گے، ان مقالہ نگاروں کے نام اور ان کے مقالات کے عنوانات یہ تھے:

(۱) المستشرقون والسیرۃ النبویۃ از الدکتور عماد الدین خلیل (عراق)، (۲) المستشرقون والاسلام از الاستاذ انور الجندی (مصر) (۳) المستشرقون والقرآن از ایضاً (۴) المستشرقون والسنۃ از ایضاً (۵) المستشرقون والسیرۃ النبویۃ از ایضاً (۶) المستشرقون والتاریخ از ایضاً (۷) ھذا ھو الاستشراق فما ھی عن تاریخہ از مولانا سعید الرحمن الاعظمی (استاذ ندوۃ العلماء لکھنؤ) (۸) اسلام اینڈ دی اورینٹلسٹ، از جناب محی الدین صاحب (لکھنؤ) (۹) مغرب کا تصور اسلام اور اس کا سیاسی پہلو، از ڈاکٹر عماد الحسن آزاد فاروقی (جامعہ ملیہ نئی دہلی) (۱۰) کیا حضرت ابراہیمؑ کی شخصیت

مدنی سورتوں میں مکی سورتوں سے مختلف ہے؟ اسپرنگر اور وینسک کے اعتراضات، از مولانا ضیاء الدین اصلاحی (دارالمصنفین اعظم گڈھ) (۱۱) اسلام اینڈ دی اورینٹلسٹ، از قاضی عبدالحمید (اندور) (۱۲) اسلام اینڈ دی اورینٹلسٹ از عبداللہ سرفراز (الہ آباد) (۱۳) استشراق اور اسلام، کل اور آج، از ڈاکٹر عابد رضا بیدار، ڈائرکٹر خدا بخش لائبریری (پٹنہ) (۱۴) مستشرقین اور علامہ محمد اقبال از پروفیسر جگن ناتھ آزاد (جموں یونیورسٹی)

ڈاکٹر عبدالکریم ساتو | اس آخری نشست کے وقفہ کے بعد جو کارروائی شروع ہوئی تو اس کی صدارت قطر کے علامہ یوسف القرضاوی نے کی، نظامت کے فرائض جناب مولانا رابع ندوی صاحب نے انجام دیے، سب سے پہلے جاپان کے ممتاز فاضل اور عالمی مساجد کونسل کے ممبر جناب ڈاکٹر عبدالکریم ساتو کو مجمع کو خطاب کرنے کی دعوت دی گئی، انھوں نے انگریزی میں اپنی مختصر تقریر میں اس سمینار کے انعقاد اور اس کے بحسن وخوبی خاتمہ پر اپنی خوشی کا اظہار کیا، پھر انھوں نے بتایا کہ وہ پشاور اور لاہور سے افغانی مہاجرین کے حالات کا جائزہ لینے کے بعد اس سمینار میں شرکت کے لیے آئے ہیں، وہ زیادہ تر افغانی مہاجرین کی مالی اور مادی امداد کرنے کی طرف توجہ دلاتے رہے، پھر بتایا کہ جاپان میں اسلام کی اشاعت کی عمر زیادہ نہیں، لیکن بحمد للہ وہاں مسلمان تیزی سے بڑھ رہے ہیں، وہاں ان کی مسجدیں اور انجمنیں ہیں، وہ اسلام کے فروغ کے لیے کوشاں ہیں اور عالم اسلام کے بھائیوں سے تعاون کے خواستگار ہیں۔

علامہ یوسف القرضاوی | ڈاکٹر عبدالکریم ساتو کے بعد علامہ یوسف القرضاوی نے عربی میں ایک جامع اور پُراثر تقریر موقع کی مناسبت سے کی، جس کا خلاصہ یہ ہے:

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے ہم کو یہ مبارک موقع عطا فرمایا، آج ہم ایک پلیٹ فارم پر اس لیے جمع ہوئے ہیں کہ اسلام کی خدمت علمی انداز سے کر سکیں اور یہ خدمت اسلام اور دور حاضر کی زبانوں میں ہو، اللہ تعالیٰ نے ہم کو یہاں اس لیے بھی جمع کیا ہے کہ ہم اس کے اور اس کے دین کی نصرت و کامرانی کے لیے میدان عمل میں اتریں، دعا ہے کہ اس کی مدد ہمارے شامل حال ہو، ہم خوش قسمتی سے ایک نئی صدی

یعنی پندرہویں صدی ہجری میں داخل ہو رہے ہیں، جب کہ ہم کو اپنا جائزہ لینا چاہیے اور اپنا احتساب کرکے ہم سب ایجاب، قول سے عمل اور انتشار سے اتحاد کی طرف گامزن ہوں، عیسائی مبلغوں، اسلام دشمن طاقتوں اور مستشرقین نے ماضی میں اپنے مادی اور فکری حملوں سے مسلمانوں کو دفاعی محاذ پر لا کھڑا کیا ہے، اور اس حالت دفاع میں ہم سوائے معذرت کرنے کے زیادہ کچھ نہ کر سکے، معذرت کا رویہ اور کمزوری کا احساس اور اظہار اب ختم ہونا چاہیے، مغرب کی سیاسی اور فکری بالادستی نے آخر انسانیت کو کیا دیا؟ ان لوگوں نے چاند پر کمندیں ڈالیں، وہاں سے مٹی اور پتھر لائے، لیکن اس ارضی سیارہ میں رہ کر اپنے نفس پر تو کوئی کمند نہ ڈال سکے اور نہ رنج وغم سے دامن چھڑا سکے، نہ خوف ودہشت سے آزاد ہو سکے، اور نہ اس روحانی سعادت کی جھلک پا سکے جس کا امتیاز سرمایۂ سکون وطمانیت ہے، یہ چیز ان کے ہاتھ کیسے آسکتی تھی، یہ تو ایمان حقیقی کے اوراک سے ملتی ہے، کیا یہ مارکسیت کے دست مادیت سے مل سکتی ہے، یا وجودیت اس کو وجود میں لا سکتی ہے؟ یا مسخ شدہ مسیحیت اس کو بازیافت کر سکتی ہے؟ نہیں، یہ نسخۂ کیمیا صرف اسلام کی حیات بخش تعلیمات میں موجود تھا، عقل ودل، دنیا وآخرت، مادہ وروح، حق وفرض، فرد کی مصلحت اور معاشرہ کی ضرورت کی بیک وقت جامعیت کا نمونہ کہیں اور بھی ہے؟ صرف اسلام کے پیغام میں یہ قوت اور اثر ہے کہ وہ انسان کو براہ راست مخاطب اور متاثر کر سکتا ہے، یہ انسان خواہ مشرق کا ہو یا مغرب کا، خلوت میں ہو یا جلوت میں، خاندان میں ہو یا معاشرہ میں، اسلام ہر حال میں اس سے مخاطب ہے، لیکن اسلام کی اس قوت اور تاثیر کے باوجود ہم خود کمزور بنتے گئے، اس کے تاریخی اور سیاسی اسباب جو بھی رہے ہوں لیکن یہی حقیقت ہے کہ مغربی تہذیب کے زیب وزینت اور چمک دمک اور اس کی ترقی وبالادستی سے ہماری آنکھیں چکا چوند رہیں، اس تہذیب کے علمبرداروں کے سیاسی، فوجی اور سائنسی غلبہ سے ہم مرعوب بھی رہے، لیکن یہ ایک وقتی بات تھی، ہم کو اس سے چھٹکارا پانا تھا، اور اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ ہم بڑی حد تک مغرب کی طلسم کاریوں سے نکل آئے ہیں، اب ہمارا رویہ معذرت خواہانہ نہ ہونا چاہیے، مستشرقین نے ہمارے مذہب کے بارہ میں بے شمار غلط فہمیاں پھیلائیں، اپنی علمی اور تحقیقی فریب کاریوں سے ہماری نسلوں کو متاثر کرنے میں کامیاب بھی ہوئے، لیکن یہ دور گذر چکا، جس طرح ہر فریب، ہر سازش اور ہر جھوٹ کا

ایک وقت ہوتا ہے، اسی طرح ان مستشرقین کا بھی ایک وقت تھا جو اب ختم ہو چکا ہے، ان کا اصلی چہرہ اب سامنے آگیا ہے، اور سچ تو یہ ہے کہ وہ طاقت ور نہیں تھے، بلکہ ہم کمزور تھے، خرگوش اور لومڑی کے اس قصے کی طرح کہ جب ایک لومڑی نے خرگوش کو دبوچا تو وہ چیخا، اس کی چیخ سن کر لومڑی کو اپنی طاقت کا احساس ہوا، اس وقت خرگوش نے کہا میں اس لیے نہیں چیخا کہ تمہاری گرفت سخت تھی، میں صرف اپنی کمزوری کو سوچ کر چیخا، تم طاقت ور نہیں ہو، ہاں میں کمزور ضرور ہوں، تو واقعہ یہی ہے کہ ہم مسلمان کمزور ہو گئے، ورنہ مستشرقین کے یہاں کوئی ایسا علمی انکشاف نہیں، جو نیا اور اچھوتا ہو اور جس کا جواب نہ ہو سکتا ہو، ان کے بعض اعتراضات اور شبہات تو ایسے ہیں کہ علمی دیانت اور متانت کو ہنسی آجاتی ہے، اب ہم کمزور نہیں رہے، بلکہ اب ہم اس دور میں ہیں جب حسن قبول ہمارے لیے چشم براہ ہے، یہ عمل کا دور ہے، گذشتہ صدیاں سرمایہ داری اور اشتراکیت کی تھیں، موجودہ صدی اسلام کی فتح مندی اور کامرانی کی ہے، ہم عہد ساز بن سکتے ہیں، جس کے بعد ہماری آیندہ نسلیں ہمارا محاسبہ کریں گی تو شاید وہ یہ اعتراف کریں کہ ہم نے اپنے دور میں دین کی خدمت میں کوئی کوتاہی نہیں کی، ہم سے کوتاہی کیوں ہو، ہمارے پاس وسائل ہیں، قوت ہے، ہماری آبادی تقریباً ایک ارب ہو رہی ہے جو معمولی قوت نہیں، اللہ تعالیٰ نے جن احسانات کا ذکر کیا ہے ان میں ایک یہ بھی ہے وَاذْكُرُوْٓا اِذْ كُنْتُمْ قَلِيْلًا فَكَثَّرَكُمْ (اعراف) یعنی یاد کرو جب تم تھوڑے سے تھے تو اللہ نے تم کو زیادہ کیا، ہمارے پاس معدنی دولت ہے، زمین کے سرسبز اور شاداب علاقے بھی ہماری ملکیت میں ہیں، اور سب سے بڑھ کر ہمارے پاس روحانی دولت کا خزانہ ہے، ہم عظیم ترین پیغام اور طاقت ور ترین عقیدے کے حامل ہیں، ہمارے پاس قابل فخر تہذیبی و تمدنی ورثہ بھی ہے، پھر ہم کیوں کمزور بنیں، ہم اللہ تعالیٰ کا جتنا شکر ادا کریں کم ہے، یہ سمینار اپنے فرائض کی ادائیگی کیلئے ایک بہترین یاد دہانی ہے، خواب غفلت سے بیدار ہونے کا ایک ذریعہ ہے، اس میں ایسے علماء و فضلاء موجود ہیں جو اس فرض کو بحسن و خوبی انجام دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان سے یہ کام لے سکتا ہے، اور کیا عجب کہ یہ سمینار اسلام کے غلبۂ نو، اس کے علم کی سربلندی اور دنیا میں حکومت اسلامیہ کے قیام کے لیے ایک نقطۂ آغاز ثابت ہو، میں دارالمصنفین، اس کے کارکنوں اور مولانا ابو الحسن علی ندوی کا شکر گذار ہوں اور ان سب حضرات کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے اس سمینار کے انعقاد، نگرانی، بحث و مباحثہ، مقالہ خوانی اور مقالوں کے عربی اور اردو ترجمے کرنے میں حصہ لیا، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہماری غلطیوں سے درگذر فرمائے اور ہم کو حق پر ثبات کی توفیق بخشے اور ہمیں اپنی مدد کا مستحق بنائے، وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین ۔

زیادہ تر مجمع اس عربی تقریر کو سمجھ نہیں رہا تھا، لیکن فاضل خطیب کی شان خطابت سے متاثر تھا، اور جب اس کا خلاصہ اردو میں سنایا گیا تو سامعین کے چہروں سے اس تقریر کی بشارت سے بشاشت کے غیر معمولی آثار نمایاں تھے، سمینار میں اس کا اہتمام تھا کہ اردو کے مقالات اور تقریروں کا خلاصہ عربی میں کیا جاتا، اسی طرح عربی میں تقریروں اور مقالوں کا ترجمہ اردو میں کر دیا جاتا، یہ فرائض مولانا محمد رابع ندوی، مولانا سعید الرحمٰن الاعظمی اور بائیس تئیس سالہ نوجوان مولوی سلمان ندوی انجام دیتے رہے، مولانا محمد رابع ندوی اور مولانا سعید الرحمٰن الاعظمی جب عربی سے اردو یا اردو سے عربی میں خلاصہ پیش کرتے تو اس کو سن کر ان کی مسلمہ قابلیت اور فضیلت کی وجہ سے کوئی تعجب نہ ہوتا، وہ توقع کے مطابق یہ فرض انجام دیتے رہے، لیکن جب کمسن مولوی سلمان ندوی اپنی فرشتہ صورت، نئی نئی خوبصورت داڑھی، قدرعنا اور جامہ زیبا کے ساتھ مائک پر آتے اور عربی یا اردو میں خلاصہ پیش کرتے وقت اپنی خطیبانہ آواز کی دلکشی سے حاضرین کی سامعہ نوازی کرتے تو وہ زبان حال سے کہتے نظر آتے کہ یہ لڑکا سمینار کی جان اور شان بنا ہوا ہے، اور سب کے دل سے دعائیں نکلتیں کہ اللہ تبارک و تعالیٰ اس نوجوان کی عمر دراز کرکے اس کو ملک و ملت کا مایۂ ناز فرزند اور خدمتگذار بنا دے، آمین ۔

علامہ یوسف القرضاوی کی صدارتی تقریر کے بعد مولانا رابع ندوی نے ایک کمیٹی کی تیار کی ہوئی تجویزیں پیش کیں، جن کو مندوبین نے متفقہ طور سے منظور کیا، یہ حسب ذیل ہیں:

اس مجلس مذاکرہ کے مضامین، نیز تجاویز کے مطالعہ سے آئندہ کے لائحۂ عمل کے لیے چھ نکات سامنے

آئے، وہ حسب ذیل ہیں :

(۱) اسلام اور مستشرقین کے موضوع پر جو لٹریچر موجود ہے اور آئندہ بھی جو لٹریچر سامنے آئے اس کا علمی مطالعہ اور تجزیہ کیا جائے اور علمی و معیاری بنیاد پر مستشرقین کی غلطیوں کو واشگاف کرنے اور ان غلطیوں کی تصحیح کے لیے ایک واضح تصنیفی و تالیفی پروگرام مرتب کیا جائے۔

(۲) اسلام، تاریخ اسلام، سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور تاریخ اسلام کی اہم شخصیتوں اور ان کے فکری، علمی اور ادبی کارناموں سے متعلق اسکول سے لے کر یونیورسٹیوں کی سطح تک کے طلبہ کے لیے جدید مذاق کے مطابق ایسی کتابیں تیار کرائی جائیں جو ان کے تعلیمی نصاب کا حصہ بن سکیں اور جن سے تعلیم و تدریس کی ہر سطح پر بچوں اور نوجوانوں کے ذہن کی تربیت کا کام لیا جا سکے۔

(۳) اسلامی موضوعات پر حوالہ جات کی معیاری کتابیں تیار کی جائیں۔

(۴) اسلام سے متعلق علم و تحقیق کے جو ادارے پہلے سے موجود ہیں ان کی علمی و تحقیقی سرگرمیوں سے واقفیت حاصل کی جائے اور ان کے یہاں جو کام ہو رہا ہے اسے موجودہ علمی و تحقیقی معیار کے مطابق اور بہتر اور مفید تر بنانے کی کوشش کی جائے۔

(۵) تصنیف و تالیف کے اس تمام کام کا علمی معیار اور تعلیمی مرتبہ دنیا کے موجودہ معیار تحقیق اور جدید اصول تعلیم کے مطابق ہو، تاکہ ان کتابوں کا مطالعہ مسلم اور غیر مسلم سب ہی لوگ دلچسپی سے کریں اور اسلام اور اسلام سے متعلق دیگر موضوعات پر صحیح معلومات حاصل کر سکیں اور مستشرقین کی کتابوں سے مستغنی ہو سکیں۔

(۶) دار المصنفین نے اسلامی موضوعات پر جو گراں قدر مطبوعات پیش کی ہیں، ان کو عربی زبان اور آج کی زندہ یوروپین زبانوں خصوصاً انگریزی میں منتقل کیا جائے، تاکہ ان سے بڑے پیمانہ پر استفادہ کیا جا سکے اور اس طرح ہم اس مذاکرہ علمی کے مقاصد کو عملی جامہ پہنا سکیں۔

اس مذاکرہ علمی کے شرکا مستشرقین کی ان علمی کاوشوں کو قابل قدر سمجھتے ہیں جو انھوں نے اسلامی

سرمایہ کی حفاظت اور بعض لغات اور مفید کتابوں کی نشر و اشاعت میں خالص علمی انداز سے کی ہیں جس سے ان سے استفادہ آسان ہو گیا، اس سلسلہ میں ہم المعجم المفہرس لالفاظ الحدیث، مفتاح کنوز السنۃ اور تاریخ ادب کی بعض کتابوں کا نام خصوصیت سے لے سکتے ہیں، اسی طرح ہم بعض انصاف پسند اور غیر متعصب مستشرقین کے مطالعۂ اسلام اور تہذیب اسلام کو قابل قدر سمجھتے ہیں مگر اسلامی علوم و فنون سے متعلق اکثر مستشرقین کی غلط فہمی اور مذہبی اور سیاسی عصبیت پر رنج و افسوس کا اظہار کرتے ہیں انھوں نے اسلامی عقیدہ و شریعت، قرآن و سنت، سیرت و تاریخ اور تہذیب و تمدن کو غلط رنگ میں پیش کیا ہے جس کے بہت سے عوامل ہیں نفسیاتی بھی تاریخی بھی اور سیاسی بھی۔

اسلام اور مستشرقین کے موضوع پر مجلس مذاکرہ کا یہ جلسہ طے کرتا ہے کہ اس موضوع پر دو دو سال کے وقفہ سے یہ مجلس مذاکرہ منعقد کی جاتی رہے، اس سلسلہ میں یہ جلسہ دکتور شیخ یوسف القرضاوی کی اس پیش کش کو کہ دو سال کے بعد مجلس مذاکرہ قطر میں منعقد کی جائے شکریہ اور تحسین کے جذبہ کے ساتھ قبول کرتا ہے، یہ جلسہ جناب حکیم محمد سعید صاحب کا بھی شکر گذار ہے کہ وہ یہ مجلس مذاکرہ قطر کے بعد پاکستان میں منعقد کرائیں گے۔

یہ جلسہ یہ بھی طے کرتا ہے کہ اس سلسلہ میں مزید پیش رفت کے لیے دار المصنفین میں ایک دفتر رابطہ قائم کیا جائے، جو سمینار کے فیصلوں کے مطابق عمل درآمد کرے اور اہم امور میں حسب ذیل فضلاء سے رابطہ قائم کرے :

(۱) مولانا سید ابو الحسن علی ندوی (ہندوستان) (۲) سید صباح الدین عبد الرحمن (ہندوستان) (۳) مولانا سعید احمد اکبر آبادی (ہندوستان) (۴) پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی (ہندوستان) (۵) دکتور شیخ یوسف القرضاوی (قطر) (۶) دکتور عبد الصبور مرزوق (رابطۂ عالم اسلامی مکہ) (۷) دکتور محمد فتحی عثمان (لندن) (۸) دکتور عبد السلام الہراس (مراکش) (۹) دکتور عبد اللہ نصیف (جدہ) (۱۰) دکتور عبد اللہ عبد المحسن الترکی (ریاض) (۱۱) دکتور عبد الوہاب ابو سلیمان (مکہ مکرمہ) (۱۲) دکتور عبد اللہ

ابن عبداللہ زاید (مدینہ منورہ) (۱۳) دکتور ظفر اسحاق الانصاری (ظہران۔ سعودی عرب) (۱۴) پروفیسر سید حسین نصر (ایران) (۱۵) ڈاکٹر سید سلمان ندوی (جنوبی افریقہ) (۱۶) ڈاکٹر محمد کمال حسن (ملیشیا) (۱۷) جناب حکیم محمد سعید صاحب (پاکستان) (۱۸) پروفیسر خورشید احمد (پاکستان) (۱۹) ڈاکٹر نبی بخش بلوچ (پاکستان)

سید صباح الدین عبدالرحمن اس کمیٹی کے سکریٹری ہوں گے، انھیں یہ اختیار ہوگا کہ وہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے مشورہ سے دفتر رابطہ کی ضروریات کے لیے مناسب اسٹاف مقرر کریں۔

خاکسار کی الوداعی تقریر

ان تجویزوں کے منظور ہونے کے بعد خاکسار نے اس سمینار کی کامیابی پر اپنے امتنان و تشکر کے جذبات کا اظہار کیا، جن کی شدت کی وجہ سے الفاظ خیالات کا ساتھ نہیں دے رہے تھے، دل تھا کہ امنڈ رہا تھا، آنکھیں اشکبار تھیں، ان ہی کیفیات کے ساتھ عرض کیا:

صدر محترم! میں اپنی اشکبار آنکھوں اور جذبات کے تلاطم کے ساتھ آپ کا، اپنے معزز اور باوقار مہمانوں اور ان ساتھیوں کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جنھوں نے اس سمینار کو کامیاب بنانے کی کوشش کی کاش میری آنکھوں میں خوشی کے اتنے آنسو ہوتے کہ ان آنسوؤں کا ایک ایک ساغر اور ایک ایک پیمانہ آپ حضرات کی خدمت میں پیش کرتا، پھر بھی میرے امتنان اور تشکر کا اظہار پورے طور پر نہ ہوتا۔ حضرات! آج سے کئی سال پہلے یہ خیال ہوا کہ "اسلام اور اورینٹلسٹ" کے عنوان سے ایک سمینار منعقد کیا جائے، دارالمصنفین کی گذشتہ اڑتالیس سالہ زندگی میں انگریز مصنفوں کی کتابیں اور تحریریں پڑھ کر ان کی زہر چکانیوں سے بڑی تکلیف محسوس کرتا رہا، کہ وہ اپنی معروضیت یعنی آبجکٹوٹی کے پردے میں ہمارے مذہب، ہماری تہذیب اور ہمارے تمدن کو طرح طرح سے نقصان پہونچا رہے ہیں خیال آیا کہ اس کے سدباب کے لیے بہت ہی شرح و بسط کے ساتھ ایک مجلس مذاکرہ منعقد کرائی جائے، مگر اس کو عمل میں لانے کے لیے ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ دارالمصنفین کے کنج عافیت بلکہ ویرانے میں کوئی شاندار اجتماع نہ ہو سکے گا، کیونکہ ہم اپنے مہمانوں کو ان کے معیار کے مطابق راحت اور سہولت نہ پہونچا سکیں گے، ہمارے دارالمصنفین کے مایۂ ناز اسلاف کا مسلک یہ رہا ہے کہ Far from The

Madding Crowd of Cities یعنی شہر کے جنون خیز ہنگاموں سے دور Under The Greenwood tree سبزہ زار کے درختوں کے سایے کے نیچے بیٹھ کر صرف اپنے علمی کاموں میں مشغول رہیں، ہم کو فخر ہے کہ ہمارے ان بزرگوں نے بوریے پر بیٹھ کر اور دنیا کی تمام آسائشوں اور نعمتوں سے منھ موڑ کر علوم و فنون کی خدمت کی، ہم نے اس مذاکرہ کے موقع پر اپنے مہمانوں کو کسی تفریح گاہ میں لے جا کر ضیافت تو نہیں کی، لیکن ہمارے بزرگ علوم و فنون کے گل و صنوبر کا جو گلشن دارالمصنفین میں بنا گئے ہیں، وہاں آکر ہمارے مہمانوں کو اگر تھوڑی بہت ذہنی تفریح ہو گئی ہوگی تو یہی ہماری محنت کا بڑا صلہ ہے، اور ہمیں یقین ہے کہ ہمارے بزرگوں کی روحیں بھی اس اجتماع میں ضرور آ گئی ہوں گی، اجازت دیجئے تو ان بزرگوں کے اس گلشن میں آنے والے مہمانوں کی خدمت میں ان کی طرف سے یہ عرض کر دوں ؎

نسیم نو بہاری کی طرح آئے جو گلشن میں / تماشائے گل و سرو و صنوبر دیکھتے جاؤ

حضرات! آپ نے اس سمینار میں جو کچھ دیکھا اس میں میری ہمت اور محنت کے بجائے مولانا ابوالحسن علی ندوی کی حوصلہ افزائی زیادہ کارفرما رہی، وہ یہ کہہ کر برابر ہمت بڑھاتے رہے کہ کام شروع ہو جائے، پھر ساری چیزیں خود بخود انجام پا جائیں گی، وہ مجھ سے اتنے اونچے ہیں کہ ان کی اونچائی تک میری نگاہ کسی طرح نہیں پہونچ سکتی، لیکن جب وہ استاذی المحترم حضرت مولانا سید سلیمان ندوی کی شاگردی کے رشتے سے مجھ کو اپنا بڑا بھائی یا برادر محترم کہتے ہیں تو مجھ کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب قیامت قریب آئی جا رہی ہے، میں نے اپنے کو ان سے بہت چھوٹا سمجھ کر اس مذاکرہ کا کام شروع کرنے کو تو کر دیا، لیکن سچ یہ ہے کہ یہاں جو کچھ ہوا وہ ان ہی کی بہار آفریں اور مشک آگیں شخصیت کی بدولت ہوا، ورنہ میری جیسی حقیر شخصیت کے ذریعہ سے اتنا بڑا اجتماع نہیں ہو سکتا تھا، اس مذاکرہ کا سب سے دردناک پہلو یہ ہے کہ آج سے دس روز پہلے ان کے عزیز بھانجے اور مولانا محمد رابع ندوی کے بڑے بھائی مولوی محمد ثانی حسنی کی وفات ہو گئی، یہ جانکاہ حادثہ نہ صرف ان دونوں کے لیے بلکہ دارالمصنفین کے لیے بھی تھا، خیال آیا کہ اس اجتماع کو ملتوی کر دیا جائے، کیونکہ اس مذاکرہ کی روح

اگر حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی تھے تو اس کے دماغ مولانا محمد رابع ندوی تھے، یہ خاکسار اس روح اور دماغ کا محض ایک جسم تھا، مگر ان دونوں حضرات نے اپنے بے مثال ضبط، تحمل اور صبر کا ثبوت دیا، ان کے پیغامات آتے رہے کہ حادثہ سخت سہی، لیکن سمینار ہو کر رہے گا، اور ہوا، اس سے دارالمصنفین سے ان کی غیر معمولی محبت کا بھی اظہار ہوتا ہے، ہم اپنے مہمانوں سے معذرت خواہ ہیں کہ ان کو ہم فائیو اسٹار ہوٹل میں نہ ٹھہرا سکے، اعظم گڈھ ایک معمولی سا شہر ہے جہاں اس ترقی یافتہ دور کی زندگی کی ساری آسائشیں میسر نہیں، یہ خیال ضرور ستا رہا کہ ہمارے غیر ملکی مہمان انشاء اللہ یہاں آجائیں گے تو ہم ان کو کہاں ٹھہرائیں گے اور ان کی کیا ضیافت کر سکیں گے، لیکن ہمارے دل میں ایک تمنا تھی، ایک آرزو تھی، اس بنا پر ہم نے سوچا کہ ہمارے مہمانوں کو تکلیف سہی، لیکن یہ سمینار ہو کر رہے گا، میں یہ جانتا ہوں کہ ہمارے مہمانوں کو بہت تکلیف ہوئی ہوگی، لیکن میں اپنے بزرگوں کی روح، دارالمصنفین کے کارکنوں اور اپنی اشکبار آنکھوں کی طرف سے ان سے معافی مانگتا ہوں کہ اپنی تکلیفوں کو سمینار کے موضوع اور اسلامی علوم و فنون کی محبت کی خاطر نظر انداز کر دیں، جہاں تک ہم لوگوں کا تعلق ہے، یہ تین روز ایسے محسوس ہوئے کہ دارالمصنفین میں ایک دلکش اور سہانی چاندنی چھٹکی ہوئی ہے اور علم و فن کے سیارے یہ آرہے ہیں، وہ جا رہے ہیں، یہ جا رہے ہیں وہ آرہے ہیں، بیٹھے ہوئے ہیں، چل رہے ہیں، قدم قدم پر، روش روش پر نئے نئے گل کھلا رہے ہیں، یہ تین دن ہماری زندگی کے بہت ہی قیمتی اور دلآویز لمحات کے ساتھ گذرے، ہماری زندگی کے بقیہ دن اسی کی یاد کے ساتھ گذریں گے، آپ حضرات اس دور افتادہ مقام کے سفر کی مشکلیں برداشت کر کے یہاں تشریف لائے، تکلیفیں اٹھائیں، لیکن ہماری ہمت افزائی کی اور حوصلے بڑھائے، ہمیں یقین ہے کہ اس اجتماع کے بعد دارالمصنفین کے رفتار میں ایک نئی علمی روح کی تابناکی اور ایک نئی علمی زندگی کی درخشانی پیدا ہوجائیگی، کشمیر کے جناب عبدالرحمن کوندو صاحب ہمارے شکریہ کے خاص طور پر مستحق ہیں، انھوں نے بتایا کہ سری نگر سے جموں تک پورا راستہ برف سے ڈھکا ہوا تھا، پھر بھی وہ دارالمصنفین کی محبت میں اس سمینار کی شرکت کیلئے

یہاں پہونچ گئے، اور ابھی ابھی لاہور سے بڑی صعوبتیں اور مصیبتیں برداشت کر کے شیخ نذیر حسین مدیر انسائیکلوپیڈیا آف اسلام تشریف لائے ہیں، ہم ان کے بھی شکر گذار ہیں۔ ہم شبلی کالج کے سکریٹری جناب امتیاز احمد صاحب ایڈووکیٹ کے بھی شکر گذار ہیں کہ انھوں نے تعاون کر کے اس سمینار کو کامیاب بنایا، ہم اس کالج کے اساتذہ اور اس کے دوسرے ملازموں کے بھی ممنون ہیں کہ انھوں نے رات دن محنت کر کے ہر قسم کی سہولتیں پہونچائیں، ہم اپنے عزیز شاگرد ڈاکٹر محمد طاہر کے تو انتہائی ممنون ہیں کہ انھوں نے اپنی جان کی بازی لگا کر ہمارے مہمانوں کے کام و دہن کی لذت کا سامان کیا، اللہ تبارک و تعالیٰ ان کو اپنی زندگی میں ہر طرح خوش و خرم رکھے، ہم شبلی کالج کے طلبہ کے بھی شکر گذار ہیں کہ انھوں نے باورچی خانہ کے مشکل سے مشکل کام کو بڑی خوبی سے انجام دے کر ڈاکٹر طاہر کی مدد کی، اس کالج کے اساتذہ میں ڈاکٹر محمد صفی اور ڈاکٹر محمد جمال کے بھی ممنون ہیں کہ انھوں نے ہمارے ایٹ ہوم کا انتظام بہت ہی خوش سلیقگی سے کیا، ہم دارالعلوم ندوۃ العلماء کے اساتذہ اور طلبہ کے احسانات سے بھی گرانبار ہیں کہ انھوں نے یہ مثالی نمونہ پیش کیا کہ ایک تقریب کو کامیاب بنانے میں مزدوروں کی طرح کام کرنے میں کوئی عار نہیں ہونا چاہیے، جب میں اپنی آنکھوں سے ان کو اپنے سروں پر کرسیاں اور میزیں لاکر ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتے دیکھتا تو مجھ کو ندامت کے بجائے فخر ہوتا کہ دارالمصنفین کے طلبہ ایسے جاں نثار بھی ہیں جو ضرورت کے وقت ہر قسم کا کام انجام دے سکتے ہیں، دارالعلوم ندوۃ العلماء کے اساتذہ میں مولانا سعید الرحمن الاعظمی کی وہ جد و جہد ہمیشہ یاد رہے گی جب کہ لکھنؤ، بنارس اور اعظم گڈھ کی مسافت کا خیال کیے بغیر تینوں جگہوں کو ایک کر دیا تھا، وہ کبھی مہمانوں کی پیشوائی کرتے دکھائی دیتے، کبھی ضروری مشورے آکر دیتے، ان کا بس چلتا تو اس موقع پر دارالمصنفین پر نچھاور ہو جاتے، ان پر دارالمصنفین کا حق تھا، اور حق تو یہ ہے کہ انھوں نے اپنا حق ادا کیا، مولانا محمود الازہار نے سمینار کو کامیاب بنانے میں جو محنت شاقہ کی اس کا شکریہ تو ادا ہو ہی نہیں سکتا اور شاید وہ اس شکریہ کو قبول کرنے کے لیے تیار بھی نہ ہوں کہ وہ اپنے اور ساتھی اساتذہ کے ساتھ دارالمصنفین اور ندوہ کو دو الگ چیز نہیں سمجھتے، اور وہاں ندوہ کے کمسن استاد مولوی سلمان ندوی کا

جو غضب کا اٹھان ہے اس سے تو میری طرح اس اجتماع کے سامنے حاضرین متحیر رہے، وہ بلبل شیوہ بیان کی طرح اس مذاکرہ میں چہچہاتے رہے، وہ جب عربی سے اردو اور اردو سے عربی میں مقالوں اور تقریروں کا خلاصہ پیش کرتے تو اس سے متاثر ہو کر حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی کے بغل میں بیٹھا ہوا ان سے عرض کرتا کہ ایک دوسرا ابوالحسن علی ندوی تیار ہونے والا ہے آپ کو اس کی فکر نہ ہونی چاہیے کہ آپ اپنا کوئی جانشین نہیں چھوڑ رہے ہیں، مولانا رابع ندوی کا کیا شکریہ ادا کروں کہ وہ میرے عزیز ترین عزیز ہیں، ان کا شکریہ ادا کر کے خود اپنا شکریہ ادا کروں گا" اور کیا یہ ڈربن سے آئے ہوئے عزیزی ڈاکٹر سید سلمان ندوی کا بھی شکریہ ادا کروں، وہ یہیں پیدا ہوئے، ان کے والد بزرگوار حضرت مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنے استاذ علامہ شبلیؒ کی وصیت کے مطابق اسی آستانہ پر عمر گذاری ان کو اپنے استاد سے اس قدر محبت تھی کہ جب وہ حیات شبلی لکھ رہے تھے تو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ بعض اوقات ایک طرف ان کا قلم چل رہا تھا تو دوسری طرف ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے، اگر ڈاکٹر سلمان ندوی ڈربن سے یہاں آئے تو انھوں نے اپنا حق ادا کیا اور اپنے مولد کی خاک کو آنکھوں سے لگا کر سعادت حاصل کی۔

ہم یو۔پی کی حکومت کے وزیر جناب عمار رضوی صاحب کے بھی احسان مند ہیں کہ انھوں نے اس سیمینار میں شرکت کر کے دارالمصنفین کے مخطوطات کی نمائش کا افتتاح کیا، ان کی پوری کوشش تھی کہ یوپی کے وزیر اعلیٰ اس موقع پر تشریف لائیں مگر وہ اپنی مصروفیتوں کی وجہ سے نہ آسکے تو انھوں نے خود اپنی تشریف آوری سے ہم کو نوازا جس سے ان کے بے تکلف دوست شوکت سلطان صاحب سابق پرنسپل شبلی کالج کو بھی بڑی خوشی ہوئی، اس تقریب میں ہر قسم کی سہولت ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور ایس۔ ایس۔ پی نے پہونچائی، جس کے لیے ہم ان کے بھی شکر گذار ہیں، اور ہاں عزیزی احتشام الرحمٰن، شاکر الرحمٰن اور محمد طارق نے اس سیمینار کی پوری کارروائی۔۔۔۔ کو ریکارڈ کر کے جتنے کیسٹ تیار کیے ہیں وہ بھی قابل ذکر ہے، یہ کیسٹ ہمارے کتب خانہ کے لیے قیمتی سرمایہ بن جائیں گے، عزیزی ڈاکٹر راشد مصطفےٰ نے اپنے ساتھی فوٹو گرافر محمد طارق کے ساتھ بڑے ذوق شوق سے

اس سیمینار کا جو رنگین البم تیار کیا ہے اس سے اس سیمینار کی یاد برابر تازہ ہوتی رہے گی، ان عزیزوں نے اپنا یہ فرض ادا کر کے اپنی سعادت مندی اور دارالمصنفین سے محبت کا ثبوت دیا،

مولانا ابوالحسن علی ندوی کی الوداعی تقریر اور موثر دعا

آخر میں حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی نے مجمع کو اس طرح مخاطب فرمایا:

حضرات! مجھے اب تقریر نہیں کرنی ہے، صرف آخری بات عرض کرنا چاہتا ہوں، پھر دعا کروں گا اور سب آمین کہیں گے، آپ حضرات کو معلوم ہے کہ میں مختلف مقامات پر جایا کرتا ہوں جہاں میری تقریر سے پہلے میرا تعارف بھی ہوا کرتا ہے، لیکن ایک تعارف کبھی نہ بھولے گا جیسا وہ انوکھا تعارف تھا، ویسا ہی میرا انوکھا شکریہ بھی اس وقت ہوگا، مجھے ریاست حیدرآباد کے شہر سکندرآباد کی جامع مسجد میں سیرت پر تقریر کرنے کے لیے بلایا گیا تھا، وہ میرے شباب کا زمانہ تھا، وہاں جامعہ عثمانیہ کے شعبۂ دینیات کے صدر مولانا محمد علی نے میرا تعارف اس طرح کرایا کہ اس خدا کا شکر ادا کرتا چاہتا ہوں جس نے میرے ان مہمان خصوصی کو یہ یہ چیزیں عطا فرمائی ہیں، اسی کا شکر ہے اسی کی میں تعریف کرتا ہوں، آج میں بھی اسی کی تقلید کرتا ہوں، میں کسی کا شکریہ ادا نہیں کرتا، میں اس خدا کی حمد کرتا ہوں جس نے ان بھائیوں کو توفیق دی کہ وہ یہاں کھنچ کر آئے اور ہماری حوصلہ افزائی کی، سب تعریف اس خدا کی ہے، سب شکر اسی کا ہے کہ ہم کو آپ کو عمل کی توفیق دی، ہم اور آپ اپنے خدا سے اس بات کے طالب ہوں کہ اب اصل کام کرائے جس کا اعلان ہم نے اس وقت بڑی بلند آہنگی سے کیا ہے، ابھی ہم نے اصل کام میں سے تھوڑا سا کام انجام دیا ہے جس کا نتیجہ ہمارے آپ کے سامنے ہے، اگر اس سے بہت زیادہ کام ہوا تو ہم آپ دیکھیں گے کہ اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے، پھر میں خدا ہی کی حمد کرتا ہوں، اسی کا شکریہ ادا کرتا ہوں، ہمارے خطیب اور مقرر شروع میں کہتے ہیں: الحمد للہ الذی ھدانا لھٰذا وما کنا لنھتدی لولا ان ھدانا اللہ، یعنی اس خدا کی تعریف ہے جس نے ہماری رہبری کی، ہم کو یہاں تک پہونچایا اور یہ اہل جنت کہیں گے کہ ہم یہاں تک پہونچنے والے نہیں تھے، اگر توفیق الٰہی نہ ہوتی، آئیے خدا سے

دعا کریں: الحمد للہ رب العلمین وصلی اللہ تبارک وتعالیٰ علی خیر خلقہ سیدنا ومولنا محمد وآلہ وصحبہ اجمعین، ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم وتب علینا انک انت التواب الرحیم، ربنا اتنا من لدنک رحمۃ وھیئ لنا من امرنا رشدا، ربنا لا تزغ قلوبنا بعد اذ ھدیتنا وھب لنا من لدنک رحمۃ انک انت الوھاب، ربنا ولا تحملنا ما لا طاقۃ لنا بہ، واعف عنا واغفر لنا وارحمنا انت مولانا فانصرنا علی القوم الکافرین، ربنا اغفر لنا ولاخواننا الذین سبقونا بالایمان، ولا تجعل فی قلوبنا غلا للذین اٰمنوا، ربنا انک رؤف رحیم۔ اے اللہ ہم اپنے علم پر نازاں نہیں ہیں، ہم علم پر کوئی بھروسہ نہیں کرتے کہ ہم نے دیکھا کہ ان مستشرقین نے جن کا علم ہم میں سے بہت سے لوگوں سے بہت زیادہ تھا، کیسی کیسی ٹھوکریں کھائی ہیں، اور دریا میں گئے اور دامن بھی ان کا تر نہیں ہوا، دریائے سیرت میں غوطہ لگایا اور ایک بھی موتی لے کر نہ ابھرے، قرآن مجید کے بحر علوم اور بحر معارف میں غواصی کی اور کچھ بھی ان کے حصہ میں نہیں آیا، اے اللہ! ہم ایسے علم سے پناہ مانگتے ہیں جو علم حقیقت تک نہ پہونچائے، جو معرفت عطا نہ کر سکے، جو صداقت کی روشنی نہ دکھا سکے، جو عمل میں رہبری نہ کرے، اے اللہ! ہم تجھ سے علم نافع کے طالب ہیں، اے اللہ ہمیں علم اور عمل کی گمراہیوں سے بچا۔

مطبوعات جدیدہ

تحفۂ علم وحکمت: مرتبہ مولانا ابو عامر محمد اسحاق خاں، تقطیع کلاں، کاغذ عمدہ، کتابت وطباعت بہتر صفحات ۵۴۲ مجلد مع گرد پوش، قیمت ۵۰ روپے پاکستانی پتے: (۱) ادارہ نشر واشاعت دار تعلیم تعلیم القرآن پلندری پونچھ آزاد کشمیر (۲) اسلامک مشن سنٹر برائے متحدہ عرب امارات ص ب ۵۱۵۲ دبی، متحدہ عرب امارات۔

مولانا محمد اسحاق خاں کا تعلق آزاد کشمیر سے ہے، مگر مدینہ یونیورسٹی سے فراغت کے بعد وہ دبئی میں سعودی عرب کے قائم کردہ اسلامک مشن سے وابستہ ہو کر دینی اور دعوتی خدمات انجام دے رہے ہیں، ان کو تصنیف و تالیف کا ذوق بھی ہے، زیر نظر کتاب میں کتب حدیث کے ذخیرہ سے پچاس حدیثیں منتخب کر کے ان کا ترجمہ اور ان کی تشریح کی ہے، یہ سب حدیثیں نہایت اہم ہیں جو نیت، اخلاص، تقویٰ، توکل، اسلامی عقائد وارکان، جہاد، حسن خلق، دعا، استغفار، ذکر، تسبیح، تحمید، طہارت، امر بالمعروف ونہی عن المنکر، اتباع سنت، اجتناب بدعت، نفاق، وراثت، رضاعت اور حدود وغیرہ سے متعلق ہیں، مجموعہ کی ابتداء نیت والی اس حدیث سے کی ہے جس سے صحیح بخاری کی ابتداء ہوئی ہے، لائق مصنف نے حدیثیں نقل کر کے ان کے بالمقابل مطلب خیز ترجمہ کیا ہے، پھر تشریح میں حدیث کا مقصود ومدعا مختلف حیثیتوں سے واضح کیا ہے مثلاً پہلے حدیث کی اہمیت و عظمت محدثین اور ائمہ اسلام کے اقوال کی روشنی میں تحریر کی ہے پھر اسکا خلاصہ اور مرکزی مضمون بتایا ہے اور اس کے ہر ہر لفظ کی تشریح کی ہے آخر میں حدیث کے فوائد نمبروار لکھ کر اس کے اہم حقایق ومعانی کی نشاندہی کی ہے اور ان سے مستنبط ہونے والے احکام وہدایات بیان کیے ہیں

اگر رسول اللہ صلعم نے حدیث کسی خاص موقع کے لحاظ سے ارشاد فرمائی ہے تو اس کی بھی وضاحت کردی ہے تاکہ اس پس منظر میں اس کا مفہوم اچھی طرح واضح ہو جائے، جن حدیثوں سے مشرکین، یہود و نصاریٰ یا خود مسلمانوں کے فرقوں اور گمراہوں کے غلط عقائد و اعمال کی تردید ہوتی ہے ان پر اس حیثیت سے بحث و گفتگو کی ہے مثلاً آنحضرت صلعم کی عدم بشریت یا امور غیبیہ سے واقفیت وغیرہ کے جو لوگ قائل ہیں ان کی مدلل تردید کی ہے، حدیث نبوی صلعم کی اس مفید خدمت پر مصنف مبارکباد کے مستحق ہیں البتہ تشریح میں تکرار اور غیر ضروری طوالت سے کام لیا گیا ہے، لغت، نحو اور اشتقاق کی بحثیں اردو داں طلبہ کیلئے زیادہ مفید نہیں، مصنف نے محدثین اور علمائے فن کے اقوال بلا حوالہ درج کیے ہیں، جن کتابوں سے حدیثیں نقل کی ہیں ان کے حوالے تو دیے ہیں مگر ابواب، جلدوں اور صفحات وغیرہ کی صراحت نہیں کی ہے، تحریر میں بھی ناہمواری اور کہیں کہیں ژولیدہ بیانی ہے، عربی کے ایسے الفاظ استعمال کیے ہیں جو اردو میں نامانوس اور غیر مستعمل ہیں، جیسے تحفیض، خطورت اور استماع وغیرہ، اسی طرح جمع جیسے اجور، جوانب، زوایا، سرائر وغیرہ لکھے ہیں، حد یہ ہے کہ عربی قاعدہ کے مطابق تثنیہ کا بھی استعمال کیا ہے، لکھتے ہیں "من اور ما دونوں کلمے عموم کیلئے آتے ہیں" بہت سے لفظوں کی جمع بنا ہے غلط نہ ہو مگر ثقیل ضرور ہے، مثلاً خونوں، جانوں، مالوں، طلوع کے معنی طلوع کرنا لکھا ہے، یہ غلط ہے، صحیح معنی طلوع ہونا ہے۔

موج صبا: مرتبہ جناب اختر مسلمی صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۱۱۶ مجلد مع گرد پوش، قیمت ۱۲ بارہ روپے، غیر مجلد ۱۰ دس روپے، پتہ: اختر مسلمی صاحب سرائے میر، اعظم گڑھ (یوپی)

جناب اختر مسلمی ضلع اعظم گڑھ کے مشہور شاعر ہیں، ان کا پہلا مجموعہ کلام ۳۰ تیس برس قبل "موج نسیم" کے نام سے شائع ہوا تھا، جو اب نایاب تھا، اس لیے زیر نظر مجموعہ میں نئے کلام کے ساتھ اس کا انتخاب بھی دیا ہے، انھیں تغزل سے خاص مناسبت ہے اور وہ حسن و عشق کے لطیف جذبات اور الفت و محبت کی واردات و کیفیات کی ترجمانی والہانہ پیرایہ میں کرتے ہیں، بہتوں کی طرح مجاز کی خاک چھاننے کے بعد وہ حقیقت کی راہ پر گامزن ہوئے ہیں، اس لئے ان کے کلام میں درد و تپش کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے اور اسی لیے انھوں نے اس مجموعہ کی ابتدا حمد و مناجات سے کی ہے، اختر صاحب کے حساس و درد مند دل نے ملک و قوم کے موجودہ حالات و مسائل اور عام معاشرتی، قومی اور سیاسی زندگی کے نشیب و فراز کا گہرائی سے مطالعہ کیا ہے، اس لیے ان ابیات کی خود غرضی، ملک و قوم کے مسائل سے ان کی غفلت، فرقہ واریت، تنگ نظری، مسلم رہنماؤں کی مداہنت اور مصلحت پسندی اور قومی، سیاسی، اخلاقی اور مذہبی زندگی کی عام ناہمواریوں اور خرابیوں کو بھی انھوں نے اپنے تغزل کا موضوع بنایا ہے، اور اخلاق و شرافت اور حق پسندی و حق بینی کا درس بھی دیا ہے مگر اس سے تغزل کی دلکشی و لطافت میں کوئی فرق نہیں آیا ہے، یہ مجموعہ تغزل کا نقش اور ما کر وہ ذوق رکھنے والوں کے لیے ضرور سامان کیف و لطف ہوگا۔ "ض"

جلد ۱۳۰ ماہ محرم الحرام ۱۴۰۳ھ مطابق ماہ نومبر ۱۹۸۲ء عدد ۵

مضامین

معارف کا سالانہ چندہ ملک و بیرون ممالک کیلئے

۱- ہندوستان	20.00	روپیے
۲- پاکستان	40.00	"
۳- سعودی عرب	62	"
۴- دیگر ممالک	86	"

"منیجر"